ایک علمی تحریک کا دینی، علمی، فکری، ادبی اور اصلاحی ترجمان

ندائے اعتدال

ستمبر ۲۰۱۶ء

ایڈیٹر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	نظام عالم مربوط ہے بیت اللہ شریف سے	مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ	
۲۔	اداریہ	ہندو مذہب اور دعوت اسلامی کے امکانات	مدیر	۳
۳۔	پیام سیرت	دل سے......دل کا شکار	محمد فرید حبیب ندوی	۷
۴۔	اسلامی تعلیمات	قربانی کے احکام و مسائل	محمد قمر الزماں ندوی	۹
۵۔	// //	ماحولیات کا تحفظ اور اسلام	مفتی تنظیم عالم قاسمی	۱۶
۶۔	// //	معذوروں اور ضعیفوں کے حقوق	حافظ کلیم اللہ عمری مدنی	۲۰
۷۔	// //	سود پر مبنی معیشت حرام کیوں؟	عتیق الرحمٰن (لاہور)	۲۵
۸۔	خصائص و امتیازات	امت محمدیہ، خصوصیات و امتیازات (قسط-۶)	محمد قمر الزماں ندوی	۲۸
۹۔	فکر اسلامی	مفکر اسلام-ایک مطالعہ (قسط-۶)	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۳۱
۱۰۔	نقد ونظر	راشد شاز اور غزوۂ بنو قریظہ	محمد غزالی ندوی	۳۴
۱۱۔	دعوت عمل	اہل دانش قلم ہاتھ میں لیں	مفتی انور خاں سرگروہ	۳۷
۱۲۔	خیر مقدم	شراب بندی قانون ۲۰۱۶ء	مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی	۳۹
۱۳۔	احتساب	دینی مدارس اور مسلکی کشمکش............	ڈاکٹر وارث مظہری قاسمی	۴۲
۱۴۔	راہ عمل	کریں کچھ کام ہم بھی............	فیروز عالم ندوی	۴۶
۱۵۔	تلیغ کے جھروکوں سے	حضرت شیخ الہندؒ کی علمی اور دینی خدمات	محمد خالد ضیاء صدیقی ندوی	۵۰
۱۶۔	یاد رفتگاں	ملک زادہ منظور احمد، ایک ادیب............	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۵۹
۱۷۔	تعارف و تبصرہ		ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۶۲
۱۸۔	شعر وادب	زندگی سب سے بڑا دھوکہ ہے انساں کے لئے	ماہر القادریؒ	

❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

ہندو مذہب اور دعوت اسلامی کے امکانات

دعوتی نقطۂ نظر سے مخاطب کی نفسیات اور اس کے مذہب کے متعلق معلومات ہونا ایک لازمی امر ہے، ہندو رسم و رواج اور ہندو مذہب کا ایک سرسری مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ہندوستان میں دعوتی نقطۂ نظر سے محنت ہونی چاہیے وہ بالخصوص اسلامی ہندوستان میں نہ ہو سکی بلکہ ان کے اثرات سے مسلمانوں کے محفوظ رہنے کے بھی صحیح طور پر انتظامات نہ ہو سکے، اگر ہندوؤں کی آپسی تفریق وتقسیم کو موضوع بنایا جاتا اور ان کے درمیان پائے جانے والے غیر انسانی رویوں کا سہارا لے کر جد وجہد ہوتی تو آج صورت حال کچھ اور ہوتی__ آج بھی حالت یہ ہے کہ دعوتی نقطۂ نظر سے ہم ان سے نہیں ملتے، آپسی میل جول کے بجائے دوریاں ہیں___ پیام توحید کی تبلیغ تو ہمارا مذہبی فریضہ تھا__ مگر ہم تو برین واشنگ اور موجودہ عہد میں اپنی پوزیشن صاف کرنے کی غرض سے بھی ان کو قریب نہیں لاتے اور نہ ان کے قریب جاتے ہیں__ آدمی صرف اپنی نجی مجلسوں کا سہارا لے اور سنجیدگی کے ساتھ کچھ لوگوں کو قریب کر کے دیکھے تو مثبت اثرات کا ظہور یقینی ہے، ہمارے سماج میں پائی جانے والی دوریاں حالات کو مزید خطرناک بنا رہی ہیں، غلط فہمیوں کو جنم دی رہی ہیں، جبکہ خلوص نیت کے ساتھ قربت اختیار کرنے سے ایک طرف تو فریضۂ دعوت کی ادائیگی کا امکان ہے، دوسری طرف سماجی امن وسکون کی تشکیل میں یہ اقدام نہایت مفید ہے، سماجی اور انسانی بنیاد پر قربت کو دعوت اسلامی کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے، موجودہ منظر نامہ میں اس عمل کی ضرورت سیاسی اعتبار سے بھی بڑھ جاتی ہے، اگر سیاست کو غلط فہمی سے بچتے ہوئے مذہب کا جزء لاینفک مانتے ہوئے دیکھا جائے تو ہندوستان میں اس وقت مسلمانوں کے لئے سیاسی قوت حاصل کرنا ایک بنیادی فریضہ ہے، اور اس فرض کی ادائیگی برادران وطن کی ذہن سازی اور ان سے خوشگوار تعلقات کے بغیر ممکن نہیں، اس کے لئے سماجی، انسانی اور رفاہی بنیادوں کے ساتھ دعوتی کردار کی کارکردگی مستقبل کا تعین کرے گی۔

یہ بات سمجھنے کی ہے کہ ہندو مذہب ایک موہوم مذہب ہے، صحیح بات یہ ہے کہ علمی اور اصطلاحی زبان میں اس کی کوئی تعریف تک نہیں کی جا سکتی، پنڈت نہرو نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیا تو اس طرح اس کی تعریف کی ہے ''بلحاظ عقیدہ ہندوازم مبہم، غیر متشکل، پہل دار اور ہر شے برائے ہر کس ہے، اس کی تعریف متعین کرنا سخت دشوار ہے، بلکہ مروج معنوں میں اسے دیگر ادیان کی طرح مذہب کہنا بھی مشکوک ہے، اس نے ماضی میں بھی ارفع وادنی اور کبھی کبھی تو متضاد رسوم وافکار کو گلے لگایا ہے، اس کی اصل روح ''زندہ رہو اور زندہ رہنے دو'' میں پوشیدہ ہے۔''

اس مذہب کے عقائد کیا ہیں، خود یہ مذہب کیا ہے، یہ آج تک مبہم ہے، کسی پیغمبر کا اس مذہب میں وجود نہیں، کوئی الہامی کتاب نہیں، نہ اس مذہب کا کوئی بانی ہے اور نہ بنیادی وآفاقی پیغام، ہر مذہب میں عبادت کا تصور اور اس کا مشترک طریقہ

لازمی امر ہے، لیکن اس مذہب میں الگ الگ خطوں کے الگ الگ مذہبی رسوم وشعائر ہیں، ہر شخص کروڑوں دیوی دیوتاؤں میں سے کسی کو بھی اپنا خدا چن سکتا ہے، الگ الگ خاندانوں کے جدا جدا متعدد معبود ہیں، اجتماعی عبادت کا کوئی مشترک طریقہ نہیں، اور ہو بھی کیوں جب خدا ہی کروڑوں کی تعداد میں ہیں، تو طریقہ ایک کیسے ممکن ہے۔

ہندووں کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ وہ دیگر اقلیتی فرقوں یعنی مسلمانوں، اچھوتوں اور دیگر قوموں کو اپنے اندر جذب کر لیں، آپ دیکھیے کہ آج بھی یہ مہم زوروں پر ہے، جبکہ دلتوں کو انھوں نے اپنے اندر جذب ہی کر لیا، اگر غور کیجئے تو ہندو مت ''مذہب'' کم ''متعصب ومتشدد قومیت'' زیادہ ہے، اس میں آریائی، بت پرست دہریے اور ثنویت کے قائل سب شامل ہیں، یہاں کے ہر مقامی فرد کو ہندو اور ان کے مذہب کو ہندو مذہب کا نام دینے کا سہرا مسلمانوں کے سر ہے، کیوں کہ مسلمانوں نے نہ قریب سے ان کا مطالعہ کیا اور نہ ان کے ذات پات اور چھوا چھوت کے غیر انسانی فعل سے دعوتی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، یہ وہ کوتاہی تھی جس کا خمیازہ آج بھی بھگت رہے ہیں، انگریزوں نے بھی یہی رویہ باقی رکھا، انہوں نے بھی ہر غیر مسلم وغیر عیسائی شخص کو ہندو شمار کیا، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ برہمن اس کے باوجود اپنے طبقاتی نظام کو باقی رکھنے میں کامیاب رہے، ہندوستان کی مردم شماری میں اصل ہندووں یعنی برہمن، ویشیہ اور کھتری ایک جگہ اصل ہندو کے طور پر درج ہوتے رہے اور اچھوتوں کا الگ مستقل اندراج ہوتا تھا۔ ۱۹۳۲ میں پونا پیکٹ کے باوجود اس کے ۸ سال بعد ۱۹۴۱ کی مردم شماری میں اچھوتوں کا مستقل علحدہ وجود باقی رہا، مسلمان وانگریز اگر چہ سب کو ہندو کہتے تھے مگر یہ تفریق باقی تھی، ۱۹۵۶ کی مردم شماری میں برہمنی دماغ نے یہ دیکھتے ہوئے کہ اب کسی کا اثر باقی نہیں رہا سب کو اپنے اندر جذب کر لیا، اس طرح دوسروں کی نظر میں جو پہلے ہی اکثریت کا درجہ رکھتے تھے اب قانونی لحاظ اور بالخصوص ووٹوں کی گنتی کے لحاظ سے اکثریت میں آ گئے، دستور ہند آج بھی درج فہرست ذاتوں کو ایک الگ شناخت دیتا ہے باوجود کہ اس نے چھوا چھوت ختم کرنے کی تاکید بھی کی ہے، اچھوتوں اور دلتوں کی نمائندہ تنظیم بام سیف کے صدر وامن میشرم صاحب برسرِ عام کہتے ہیں کہ ''میں مسلمانوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ہمیں ہندو نہ کہیں بلکہ ہمیں یا تو دستور کے دیے گئے ناموں SC. ST. OBc. سے پکاریں یا اچھوت وشودر کہہ لیں یا کوئی گالی دے لیں ہم برداشت کر لیں گے مگر ہمیں ہندو نہ کہیں، اس لیے کہ یہ کہہ کر وہ ہمیں ہندوؤں کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں اور ہم پر ہزاروں سال سے ہوتے ہوئے ظلم کی راہ کو ہماری حیثیت مٹا کر مزید ہموار کر دیتے ہیں۔''

ہندو مذہب میں تفریق کا جو نظام ہے وہ انتہائی خطرناک وخوفناک ہے، بنیادی طور پر سب سے اونچی ذات برہمنوں کی ہے، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ برہما کے سر سے پیدا ہوئے، دوسرے نمبر پر کھتری ہیں جن کے بارے میں خیال ہے کہ وہ برہما کے کندھوں اور ہاتھوں سے پیدا ہوئے، ان سے نیچے تیسرے نمبر پر ویشیہ ہیں جن کے متعلق بیان ہے کہ وہ برہما کی ران سے پیدا ہوئے اور سب سے نیچے شودر ہیں جو کہ برہما کے پاؤں سے پیدا ہوئے۔

جتنے اعلیٰ مناصب اور اشراف کے کام ہیں نیز مذہبی رسومات کی انجام دہی وہ سب برہمنوں کے حصہ میں ہے، کھتریوں کے کام برہمن سے کم تر درجہ کے ہیں مگر وہ مخدوم نہیں برہمنوں کے خادم ہی ہیں، اس معنی کر کہ بہت سے امورِ خدمت خواہ اعلیٰ درجہ

کے صحیح ان کے ذمہ ہیں، ویشیہ کے کام بھی قریب قریب ایسے ہی ہیں لیکن کھتری سے نیچے کے ہیں، لیکن شودروں کے کام دیکھیے، مذکورہ بالا تینوں طبقات کی خدمت کرنا، ان کی نوکری کرنا، ان کے اترے ہوئے کپڑے پہننا، ان کا جھوٹا کھانا، دودھ گھی، شہد اناج وغیرہ کی سوداگری کرنا، اسے علم حاصل کرنے کا حق نہیں، یہ برہمن کو کوئی گالی یا سخت بات کہہ دے تو زبان کاٹ لی جائے، اس کے لیے سخت ترین سزائیں ہیں، جبکہ برہمنوں کے لیے بڑے سے بڑے جرائم پر بھی کوئی سزا نہیں، یہ منوشاستر کے قوانین ہیں، برہمنوں کے لیے یہودیوں کی تحریف کی طرح زیادہ سے زیادہ یہ سزا ہے کہ وہ اشراف ہیں اس لیے بطور سزا ان کے بال منڈوا دیے جائیں یا انہیں ملک بدر کر دیا جائے۔

یہی نہیں بلکہ آگے بڑھیے تو نظر آئے گا کہ اگر برہمن طبقاتی فرقہ پرستی کا شکار ہیں تو شودر انفرادی فرقہ ر پرستی کا شکار ہیں، ان کے اصل دشمن برہمن نہیں بلکہ وہ خود ہیں، وہ ذاتی مفاد کے لیے خود اپنوں کو بلی چڑھا دیتے ہیں، اسی لیے موجودہ عہد میں ہم دیکھتے ہیں کہ دلتوں کے لیڈر ہزاروں سال سے ظلم کی دہائی دے کر اٹھتے ہیں اور پھر اپنا ضمیر بیچ کر برہمنوں کی غلامی قبول کر لیتے ہیں، مقصد صرف ذاتی مفادات اور وقتی منفعت ہوتا ہے۔

منوسمرتی جس میں نہایت مضحکہ خیز معلومات بھی ہیں اور آخری درجہ کے خطرناک قوانین بھی، منو کے قانون کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ہندوؤں کا مذہبی قانون ہے جو تقریباً تین ہزار سال سے رائج رہا ہے، صحیح بات یہ ہے کہ اس کے بدنام زمانہ قوانین یہودی پروٹوکولز کی طرح محض اپنی بالا دستی قائم رکھنے اور غیر منصفانہ وغیر مساواتی رویہ کو برقرار رکھنے کے لئے برہمنوں نے وضع کیا، دلتوں میں بڑی طاقت ور اور نمائندہ شخصیت ڈاکٹر امبیڈکر کی ہوئی ہے، وہ آزاد ہندوستان کی دستور ساز کمیٹی کے چیرمین بھی رہے، ان کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ انہیں کتابوں کا بڑا شوق تھا، انہوں نے ایک بڑا کمرہ بنوایا تھا، اس میں تقریباً اس دور میں ۳۰ ہزار روپیہ سے زائد کی کتابیں تھیں، ایک دن اچانک اپنی لائبریری سے انہوں نے منوسمرتی کو اٹھا کر جلا دیا، اس میں کوئی تعجب نہیں، کیوں کہ باباصاحب کے نزدیک مذہبی بنیاد پر تفریق کرنے والی اور انسانوں کو جانوروں سے بھی بدتر پیش کرنے والی اس کتاب کا جلایا جانا ہی ضروری تھا، انھیں نے اس غیر انسانی مذہب سے نفرت ہوگئی تھی، یہی وجہ ہے کہ اپنے مطالعہ کے نتیجہ میں وہ اسلام قبول کرنے کے قریب پہنچ چکے تھے مگر گاندھی جی کا منتر کام کر گیا، گاندھی جی کو علم تھا کہ امبیڈکر کے قبول اسلام سے کیا انقلاب آئے گا، وہ اعلیٰ طبقہ کی ہی حکومت چاہتے تھے، ذات پات کی تفریق ان کے نزدیک ایک اچھا اصول تھا، جبکہ امبیڈکر کے اسلام سے اس اصول کی بقا خطرے میں پڑ جاتی۔

یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اب اس کے قانون کو کون مانتا ہے؟ مگر صحیح یہ ہے کہ برہمن راج اسی کا عکاس اور ہندوراسٹر کی سوچ اسی کی دین ہے، لوگ انکار صرف اپنے مذہب کی غیر انسانی تعلیمات پر پردہ ڈالنے کے لیے کرتے ہیں، ورنہ اعلیٰ طبقہ کا ہر فرد اس کا مطالعہ بڑے شوق سے کرتا ہے، پھر اس کے انگ انگ سے تعصب انگڑائی لیتا ہے اور تشدد کا لہو دانتوں سے ٹپکتا ہے، اس کے قوانین پر عمل کے مظاہر آج بھی آئے دن ظاہر ہوتے رہتے ہیں، انسانوں کے ساتھ بھیانک غیر انسانی سلوک کی تصویریں اور مثالیں خوب پیش آتی ہیں، اب سوشل میڈیا نے یہ مناظر دکھانے کا کام بہت آسان کر دیا ہے، اب تک برہمن واد کی حامی میڈیا

نے اس پر پردہ ڈال رکھا تھا، ابھی بھی گجرات، راجستھان اور پھر یوپی میں قابل رحم مناظر دیکھے گئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ برہمنوں نے تمام ملکی وسائل پر قبضہ کے لیے اور اپنی حکومت باقی رکھنے کے لیے اچھوتوں کو ہندو مان لیا__ لیکن ایک حد تک ہی مانا ہے__ آج بھی بے لگام نہیں ہونے دیا۔ بس انہوں نے ذرا اپنے آپ کو ماڈریٹ Moderate کیا ہے اور یہ کوشش کی ہے سانپ بھی مرتا رہے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے، مہذب دنیا کے سامنے اپنے آپ کو پیش کرنے کے لئے بعض تبدیلیوں کا نظر آنا ضروری تھا، دیہی علاقوں میں بڑے پیمانہ پر آج بھی منو کے مظالم جاری ہیں جبکہ ذات پات کی تفریق کا قانون تو شہری اور تعلیم یافتہ سماج میں بھی شباب پر ہے۔

بڑی حد تک وہ سختیاں اور شدت پسندی اب ظاہر نہیں ہوتی جو ''ستی'' اور دیگر رسومات کے نام سے جانی جاتی تھی، کم سنی میں شادی کی ممانعت کا قانون بن گیا، مگر آج بھی بہت سے علاقوں میں ہوتی ہے، چھوا چھوت کا نظام باقی ہے، دلت ہندو بن کے رہیں، اس کے لیے ایک حد تک رعایت ہے، مگر وہ غالب نہ ہوں، اس کے لیے اعلیٰ طبقہ آج بھی منوسمرتی کے قانون پر عمل پیرا ہے۔

یہ بات معلوم ہے کہ اس ملک میں بسنے والی مختلف اقوام نے اسلام کو اپنایا، مشرف بہ اسلام ہونے والوں کی اکثریت شودروں اور اچھوتوں کی رہی ہے، اب ضرورت اس کی ہے کہ واقعات اور مواقع سے فائدہ اٹھایا جائے، حکمت کے ساتھ کمزوریوں کو ظاہر کیا جائے، پسماندہ اور ستائے ہوئے لوگوں سے قربت پیدا کی جائے، منصوبہ بند طریقہ سے ان کو اپنے پروگراموں میں، تقریبات میں شامل کیا جائے ان سے میل جول کی جو شکلیں بھی ممکن ہوں انھیں اختیار کیا جائے، اور اس طرح مختلف طریقوں سے ان کے سامنے تقابلی طور پر مذہب اسلام کی حقانیت کو پیش کیا جائے، کیا عجب ہے کہ یہ قوم جو موہوم خیالات کو مذہب سمجھتی ہے رفتہ رفتہ حلقہ بگوش اسلام ہونے لگے، ایسا اگر ہوا ہوتا تو نقشہ آج کچھ اور ہوتا، مگر افسوس کہ اس ملک میں ہم نے وہ کام نہ کیا جو کرنے کا تھا، آج بھی اگر نقش کہن مٹانے، داغ اجنبیت دھونے اور فریاد مظلومی کو دادرسی کی پوزیشن میں تبدیل کرنے کا عزم ہے تو سماجی رویہ کو تبدیل کرنا پڑے گا، انسانی اور رفاہی طریقوں کے ذریعہ سے برادران وطن کو اسیر انسانیت بنا کر اسلام کے قریب لانا ہوگا، یہی وہ بنیادی اور کارگر وطاقت ور نسخہ ہے جس کے بغیر آج اس ملک میں ہماری حالت غیر ہے اور مستقبل میں اسی کی بدولت یہ حال سنور بھی سکتا ہے اور ملک کا نقشہ واقتدار سب بدل سکتا ہے، شرط یہ ہے کہ ہم بدلیں اور اپنا رویہ تبدیل کریں، اور اس احساس کو عملی زندگی کا حصہ بنائیں کہ اسلام کے آفاقی وآبادی پیغام اور اس کی انسانی تعلیمات کی تبلیغ واشاعت ہمارا فریضۂ منصبی ہے، علماء واہل مدارس کے لیے سوچنے کا مقام ہے کہ اگر بروز قیامت ہندوستان کے غیر مسلموں نے یہ عذر پیش کیا کہ ہم تک پیام توحید پہنچایا ہی نہ گیا تو جواب کیا ہوگا؟؟؟

☆☆☆

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

پیام سیرت

دل سے......دل کا شکار

محمد فرید حبیب ندوی
Mob. 9012621589

''اے اللہ! خطّاب کے بیٹے یا ہشام کے بیٹے سے اسلام کو عزت عطا فرما''

رات کے سناٹے میں
دل کی گہرائی سے
برستی آنکھوں کے ساتھ
کپکپاتے ہاتھ پھیلا کر
ایک بندۂ خدا اپنے پروردگار کے سامنے یوں اپنا کلیجہ نکال کر رکھ رہا تھا۔
کیا درد تھا.............جس نے پتھر کو بھی موم کر دیا!!
کیا تڑپ تھی ....جس کے آگے پہاڑ بھی دست بستہ کھڑے ہو گئے!!
کیا جگر سوزی تھی ....جس نے بجھتی شمع کو بھی روشن کر دیا!!
رات کے سناٹے میں نکلا ہوا یہ ''درد'' تیر بہدف ثابت ہوا۔
شب دیجور کی تاریکیوں کو چیرتا ہوا یہ جملہ سیدھا نشانہ پر لگا۔
اور.............اور.........دل......دل کا......شکار ہو گیا۔
اور......خطاب کا بیٹا اسلام کی آغوش میں آ گرا۔
وہ عمر......جس کے آگے قوت بھی دم بخود رہتی تھی......ایک ''درد دل'' کے سامنے ٹھہر نہ سکا۔
وہ عمر......جس پر شجاعت کو بھی ناز تھا......ایک جنبش لب کی تاب نہ لا سکا۔
ہاں......وہ شہسوار عرب......بے باکی جس کی لونڈی تھی......
ایک آہ سحر گاہی سے رام ہو گیا۔
خطاب کا بیٹا...... جسے کوئی شکار نہ کر سکا...... ایک دعا سے شکار ہو گیا۔
''دعا کے شکار'' اسی عمر نے آگے چل کر بہادری کی ایک نئی تاریخ رقم کی۔
''محمد کے خون'' کے پیاسے اسی ابن خطاب نے محمد کی جاں نثاری کے انمٹ نقوش چھوڑے۔
لیکن......آہ! ......وہ آہ......بھی کیسی ہوگی!!!
کیسی ہوگی وہ سسکی!!!
کتنی گہرائی سے نکلی ہوگی وہ صدا......!!!
اور کتنے پردوں کا جگر چاک کرتے ہوئے اٹھی ہوگی وہ آواز!!!
اس دعا نے اسلام کو کتنی قوت و رفعت بخشی!!
اس ''نالۂ نیم شبی'' نے مسلمانوں کو کتنی عظمت عطا کی!!!
یہی دعا تھی......جس نے آگے چل کر......آدھی دنیا پر حکومت کی۔

یہی دعا تھی......جس نے قیصر وکسری کے خزانوں کو پامال کیا۔
یہی دعا تھی............جس کے نام سے دنیا تھر تھرانے لگی۔
سلام ہو آقائے دو جہاں پر
اور سلامتی ہو خطاب کے بیٹے پر
محمد ﷺ نے - جو اس وقت بے سہارا تھے- ''اس شمشیر بے نیام'' کو قابو میں کرنے کے لئے اسی ''آہ'' کا سہارا لیا۔
وہ جانتے تھے کہ مشکل اوقات میں دعا ہی رنگ لاتی ہے۔
وہ واقف تھے اس بات سے- اور کیوں نہ واقف ہوتے کہ اعرف العارفین تھے- کہ دعا سے تقدیریں بدل جاتی ہیں۔
یہ دعا مومن کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔
یہ دعا داعی کی سب سے بڑی قوت ہے۔
آج داعی تو بے شمار ہیں۔
اسلام کی طرف بلانے والوں کی کوئی کمی نہیں۔
ایک سے بڑھ کر ایک خطیب
ایک سے بڑھ کر ایک قلمکار۔
مگر آہ......!!!......آج کوئی عمر کیوں اسلام کی آغوش میں نہیں آتا۔
رات کی تاریکیاں آج بھی اسی ''زخمی جگر'' کو ڈھونڈ رہی ہیں۔
چمکتے ستارے آج بھی اسی ''دردِ دل'' کے متلاشی ہیں۔
رات کا پرسکون سناٹا آج بھی اسی ''صدائے عاجزانہ'' کے لئے گوش بر آواز ہے۔
مگر......!!......تاریکی اجالے میں بدل جاتی ہے۔
ستارے مایوس ہو کر ڈوب جاتے ہیں۔
سناٹا شور میں تبدیل ہو جاتا ہے۔
لیکن............وہ درد......اب نہیں سنائی پڑتا۔
وہ......آہ......اب نہیں کانوں سے ٹکراتی۔
وہ حرارت قلب......اب نہیں محسوس ہوتی۔
یہ واقعہ ہمیں ایک سبق دیتا ہے۔
داعی کے لئے ایک پیغام رکھتا ہے۔
کہ دن کی چہل پہل کے ساتھ
اجالے کی دوڑ دھوپ کے ساتھ
تقریر کے جوش اور تحریر کی روانی کے ساتھ
آنسو کے دو قطرے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔
اور ......دعوت میں ......خونِ جگر......کی آمیزش بہت ضروری ہے۔
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر۔
دشمن کے لئے ہلاکت کی بددعا کرنے کے بجائے
خون کے پیاسوں کو کوسنے اور ان پر لعنت برسانے کے بجائے
رات کی تاریکی میں آج بھی ''خطاب کے بیٹے'' کو مانگنے کی ضرورت ہے۔
دعا میں اب بھی وہ تاثیر ہے جو دامنِ اسلام کو مال مال کر سکتی ہے۔
خونِ جگر میں آج بھی وہ حرارت ہے جو پتھروں کو موم بنا سکتی ہے۔
سوزشِ عشق میں آج بھی وہ سوز ہے جس کی تپش سے قساوت بھی پگھل سکتی ہے۔
بس ضرورت ہے اسی تڑپ کی............اسی درد......اور اسی آہ کی......۔
کاش !!......ہمیں بھی اس ......آہ...... کا کوئی ذرہ نصیب ہو جائے!!!
ہائے کاش......!!!!......کاش......!!!!!

☆☆☆

اسلامی تعلیمات

قربانی کے احکام ومسائل

محمد قمرالزماں ندوی
maeducationalsociety@gmail.com

قربانی کا اجر وثواب بے حد وحساب ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''قربانی کے دنوں میں قربانی سے زیادہ کوئی چیز اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔ ان دنوں میں یہ نیک کام سب نیکیوں سے بڑھ کر ہے اور قربانی کرتے وقت یعنی ذبح کرتے وقت خون کا جو قطرہ زمین پر گرتا ہے تو زمین تک پہنچنے سے پہلے ہی اللہ کے پاس مقبول ہو جاتا ہے تو خوب خوشی اور دل کھول کر قربانی کیا کرو۔ ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا کہ ''قربانی کے جانور کے بدن پر جتنے بال ہوتے ہیں ہر بال کے بدلہ میں ایک نیکی لکھی جاتی ہے'' اس کے ساتھ حدیث میں یہ وعید بھی ہے کہ جو شخص وسعت رکھنے کے باوجود قربانی نہ کرے، وہ ہماری عیدگاہ کے قریب نہ آئے۔

قربانی کن پر واجب ہے؟

ہر مسلمان (مرد و عورت) آزاد، مقیم، جو ضروریات زندگی کے علاوہ مقدار نصاب یعنی ساڑھے سات تولہ (تقریباً ساڑھے ستاسی گرام) سونا یا ساڑھے باون تولہ (تقریباً 612.50) چاندی یا اس کی قیمت یا بنیادی ضروریات کے علاوہ اس قیمت کی جائیداد و سامان کا دسویں ذی الحجہ کی صبح کو مالک ہو، اس پر قربانی واجب ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کے یہاں بالغ، عاقل ہونا ضروری نہیں، اگر نابالغ بچہ یا پاگل اتنی جائیداد کا مالک ہو جس میں زکوٰۃ واجب ہو جایا کرتی ہے تو اس پر قربانی واجب ہے، اور اس کا باپ یا اس کا ولی اس کی طرف سے قربانی کرے گا۔ ایک دوسری روایت کے مطابق مستحب ہے اور اسی قول کو اکثر فقہاء احناف نے قابل ترجیح قرار دیا ہے، البتہ ایسے افراد کی طرف سے صدقۂ فطر کی ادائیگی کو واجب قرار دیا گیا ہے۔ جس پر صدقۂ فطر واجب ہے، اس پر بقرعید کے دنوں میں قربانی کرنا بھی واجب ہے۔ اگر اتنا مال نہ ہو جتنے کے ہونے سے صدقۂ فطر واجب ہوتا ہے تو اس پر قربانی واجب نہیں ہے، اگر پھر بھی کرے تو ثواب کا مستحق ہوگا۔ مسافر پر حالت سفر میں قربانی واجب نہیں ہے۔ دسویں گیارہویں اور بارہویں تاریخ کو سفر میں تھا، پھر بارہویں تاریخ کو سورج ڈوبنے سے پہلے گھر پہنچ گیا، یا پندرہ دن کہیں ٹھہرنے کی نیت کر لی تو اب اس پر قربانی کرنا واجب ہو گیا، اسی طرح پہلے اگر اتنا مال نہ تھا، اس لئے قربانی واجب نہ تھی، پھر بارہویں تاریخ سورج ڈوبنے سے پہلے کہیں سے مال مل گیا تو قربانی کرنا واجب ہے۔

قربانی کا جانور

قربانی کے جانوروں میں اونٹ پانچ سال سے کم نہ ہو، بیل، بھینس، گائے دو سال سے کم نہ ہوں، اور بھیڑ، بکری، دنبے ایک سال سے کم نہ ہوں۔ اگر بھیڑ اور دنبہ چھ ماہ سے زائد کا ہو اور اتنا موٹا ہو کہ ایک سال کا نظر آرہا ہو تو اس کی قربانی جائز ہے۔ قربانی کے جانور کو فربہ، تندرست اور بے عیب ہونا چاہئے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ قربانی کے

جانوروں کو کھلا پلا کر خوب قوی کیا کرو کیونکہ پل صراط پر وہ تمہاری سواری ہوں گے۔قربانی کا جانور اگر ایسا مریل اور دبلا، کمزور ہو کہ اس کی ہڈیوں میں گودا ہی نہ رہ گیا ہو تو اس کی قربانی درست نہیں۔ایسا جانور جو اندھا ہو یا کانا یا لنگڑا ہو جو مذبح تک نہ جا سکتا ہو یا اس کا کوئی عضو (مثلاً کان یا دم) تہائی سے زیادہ کٹا ہوا ہو تو ان سب کی قربانی جائز نہیں۔جس جانور کی سینگ پیدائشی طور پر ہی نہ نکلی ہو یا نکلی ہو مگر کچھ حصہ ٹوٹ گیا ہو تو اس کی قربانی جائز ہے۔البتہ جس جانور کی سینگ بالکل جڑ سے ہی ٹوٹ گئی ہو تو اس کی قربانی جائز نہیں ہے۔وہ جانور جس کے پیدائشی طور پر کان نہیں ہیں یا ہیں تو بہت چھوٹے ہیں اس کی قربانی درست ہے۔جس جانور کے دانت بالکل ہی نہ ہوں اس کی قربانی درست ہے۔گائے اور بکری اگر حاملہ ہو تو اس کی قربانی بھی جائز ہے۔اگر بچہ زندہ ہی برآمد ہو تو اس کو بھی ذبح کر لینا چاہئے۔ دنبہ، بکرا، بکری، بھیڑ کی قربانی صرف ایک آدمی کی طرف سے ہو سکتی ہے۔ایک سے زائد کئی آدمی اس میں حصہ دار نہیں ہو سکتے۔ بیل، گائے اور اونٹ میں سات حصے ہو سکتے ہیں۔سات سے زائد نہیں۔مگر اس کے لئے دو شرطیں ہیں۔پہلی یہ کہ حصہ دار کی نیت قربانی یا عقیقہ کی ہو، محض گوشت حاصل کرنے کی نہ ہو۔ (اس سے معلوم ہوا کہ قربانی کے جانور میں عقیقہ کی نیت سے شریک ہوا جا سکتا ہے) دوسری شرط یہ ہے کہ حصہ دار کا حصہ ٹھیک ساتواں حصہ ہو۔اس سے کم کا حصہ دار نہ ہو، ان دو شرطوں میں سے کوئی شرط بھی پوری نہ ہو تو کسی کی قربانی صحیح نہیں ہوگی۔

گائے، بھینس اور اونٹ میں سات افراد سے کم بھی شریک ہو سکتے ہیں۔مثلاً کوئی دو، چار یا کم وبیش حصہ لے۔مگر اس میں یہ شرط ضروری ہے کہ کوئی بھی حصہ دار ساتویں حصہ سے کم کا شریک نہ ہو، ورنہ کسی کی قربانی درست نہ ہوگی۔جن لوگوں کے بھی حصہ رکھے جائیں ان کے کہنے سے رکھے جائیں۔یہ نہیں کہ قربانی کا حصّہ دار تجویز کر کے قربانی تو پہلے کر لی جائے اور حصہ داروں کی مرضی و اجازت بعد میں حاصل کی جائے تو اس صورت میں قربانی صحیح نہ ہوگی۔نر اور مادہ دونوں کی قربانی جائز ہے، اس میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں ہے؟

چند اہم مسائل:

کسی پر قربانی واجب نہیں تھی لیکن اس نے قربانی کی نیت سے جانور خرید لیا تو اس جانور کی قربانی واجب ہو گئی۔کسی پر قربانی واجب تھی لیکن قربانی کے تینوں دن گزر گئے اور اس نے قربانی نہیں کی تو ایک بکری یا بھیڑ کی قیمت کے برابر خیرات کر دے، اور اگر بکری خریدی تھی تو بعینہ وہی بکری خیرات کر دے۔(شامی)۔

اگر قربانی کے لئے جانور خریدا اس وقت کوئی ایسا عیب پیدا ہو گیا جس سے قربانی درست نہیں تو اس کے بدلے دوسرا جانور خرید کر قربانی کرے، ہاں! اگر غریب آدمی ہو جس پر قربانی واجب نہیں تو اس کے واسطے درست ہے کہ وہی جانور قربان کر دے۔ متوفی رشتہ داروں، آنحضرت ﷺ اور دوسرے بزرگوں کی طرف سے قربانی کرنا درست ہے۔البتہ قربانی واجب ہے تو اپنی طرف سے کرنے کے بعد جب سہولت اور گنجائش ہو تو دوسروں کی طرف سے کرے۔اگر اپنی خوشی سے کسی مردے کو ثواب پہنچانے کے لئے قربانی کرے تو اس کے گوشت میں سے خود کھانا، کھلانا، بانٹنا سب درست ہے، لیکن اگر میت کی وصیت پر قربانی کرتا ہے تو پورا گوشت فقراء اور مساکین پر صدقہ کرنا واجب ہے۔اسی طرح اپنی قربانی کا گوشت کافروں کو بھی دینا جائز ہے بشرطیکہ اجرت میں نہ دیا جائے۔(عالمگیری) قربانی کی کھال کی قیمت کسی کو اجرت میں دینا جائز نہیں، اس کا خیرات کرنا ضروری ہے۔قربانی کی کھال کی قیمت کو مسجد کی مرمت یا کسی اور نیک کام میں لگانا درست نہیں۔خیرات ہی کرنا چاہئے، اگر کھال کو اپنے کام میں استعمال کرے مثلا مشک یا ڈول یا جائے نماز وغیرہ بنوا لیا تو بھی درست ہے، قصائی کو گوشت، چربی مزدوری میں نہ دے بلکہ مزدوری اپنے پاس سے الگ دے۔قربانی

کرتے وقت زبان سے نیت پڑھنا اور دعا پڑھنا ضروری نہیں، اگر دل میں خیال کرلیا کہ میں قربانی کرتا ہوں اور زبان سے کچھ نہیں کہا صرف باسم اللہ، اللہ اکبر کہہ کر ذبح کر دیا تو بھی قربانی درست ہوگئی، اگر یاد ہو تو پڑھ لینا ہی بہتر ہے۔

قربانی کا وقت

بقرعید کی دسویں تاریخ سے لے کر بارہویں تاریخ کی شام تک قربانی کرنے کا وقت ہے۔ چاہے جس دن قربانی کرے۔لیکن قربانی کرنے کا سب سے بہتر دن بقرعید کا دن ہے پھر گیارہویں تاریخ پھر بارہویں تاریخ۔ بقرعید کی نماز ادا ہونے سے پہلے قربانی درست نہیں۔ جب لوگ نماز پڑھ چکیں، تب کرے۔ رات کو قربانی جائز ہے پسندیدہ اور بہتر نہیں۔ قربانی کے جانور کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرنا افضل ہے اگر خود ذبح کرنا نہ جانتا ہو تو کسی اور سے ذبح کروالے اور ذبح کے وقت وہاں جانور کے سامنے کھڑا ہو جانا بہتر ہے۔

قربانی کا طریقہ

جانور کو قبلہ رُخ لٹا کر پہلے یہ دعا پڑھے: "**اِنی وجهت وجهی للذی فطر السماوات والارض حنیفا وما انا من المشرکین. ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للّٰه رب العالمین لا شریک لهٗ وبذلک امرت وانا اول المسلمین. اللّٰهم منک ولک، بسم اللّٰه اللّٰه اکبر**" اب ذبح کیجئے اور ذبح کرنے کے بعد کہے: "**اللّٰهم تقبّل منی کما تقبلت من حبیبک محمد وخلیلک ابراهیم علیهما الصلوٰة والسلام**" اگر آپ دوسرے کی طرف سے ذبح کر رہے ہوں تو منی کی بجائے من کہہ کر اس کا نام لیجئے۔

قربانی کا گوشت

افضل اور بہتر ہے کہ قربانی کا گوشت ایک تہائی غرباء و مساکین پر صدقہ کرے، ایک تہائی اپنے عزیزوں اور دوستوں کو دے اور ایک تہائی اپنے اہل و عیال کے لیے رکھ لے، لیکن اگر کسی شخص کا کنبہ بڑا ہو یا کوئی اور ضرورت ہو تو تمام گوشت خود خرچ کر سکتا ہے البتہ فروخت کرنا یا قصاب کو مزدوری میں دینا منع ہے، کئی حصہ دار ہوں تو قربانی کا گوشت آپس میں برابر وزن سے تقسیم کیا جائے، اندازے سے تقسیم کرنا جائز نہیں۔

قربانی کرنے والے کے لئے بال و ناخن تراشنے کا حکم:

قربانی کرنے والے کے لئے بال و ناخن تراشنے کا حکم: جو شخص قربانی کرے اس کے لئے مستحب ہے کہ ماہ ذی الحجہ کے آغاز سے جب تک قربانی نہ کرلے، جسم کے کسی عضو سے بال و ناخن صاف نہ کرے کہ قربانی کرنے والا اپنی جان کے فدیہ میں قربانی کر رہا ہے اور قربانی کے جانور کا ہر جزو قربانی کرنے والے کے جسم کے ہر جزو کا بدلہ ہے تاکہ جسم کا کوئی جزو نزول رحمت کے وقت غائب ہو کر قربانی کی رحمت سے محروم نہ رہے۔ اس لئے آنحضرتؐ نے مذکورہ حکم دیا ہے، لیکن چالیس دن سے زائد مدت ہو جاتی ہو تو کراہت سے بچنے کی خاطر بال وغیرہ کی صفائی میں ڈھیل اور سُستی نہ کرے۔(شامی بحوالہ فتاویٰ رحیمیہ ج:۲۔ص:۸۸)

تکبیر تشریق کی حقیقت و اهمیت

تکبیرات تشریق کی ابتدا نویں ذی الحجہ کی فجر سے لے کر تیرہویں ذی الحجہ کی نماز عصر تک ہے۔ان تکبیرات کا حکم یہ ہے کہ فرض عین نماز جو جماعت مستحب کے ساتھ ادا کی گئی ہو، اس کے بعد متصلاً تکبیرات کا پڑھنا واجب ہے۔ تکبیرات تشریق کے الفاظ یہ ہیں: "**اللّٰه اکبر، اللّٰه اکبر، لا اله الا اللّٰه، واللّٰه اکبر، اللّٰه اکبر، وللّٰهِ الحمد**".

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تکبیرات تشریق عورتوں پر نہیں ہیں لیکن مفتیٰ بہ قول یہ ہے کہ باجماعت نماز پڑھنے والے اور تنہا نماز پڑھنے والے اس میں برابر ہیں۔ اسی طرح یہ تکبیر مرد، عورت دونوں پر واجب ہے، البتہ عورت بآواز بلند تکبیر نہ کہے بلکہ آہستہ کہے۔(شامی وفتاویٰ دارالعلوم دیوبند)۔

تکبیرات تشریق کا متوسط بلند آواز سے کہنا ضروری ہے، بہت سے لوگ اس میں غفلت کرتے ہیں یا تو پڑھتے ہی نہیں یا آہستہ پڑھ لیتے ہیں، اس کی اصلاح ضروری ہے۔(جواہر الفقہ: ج:اول۔ص:۴۴۶)

خصی شدہ جانور کی قربانی:

خصی شدہ جانور کی قربانی جائز ہے، اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں، درّمختار میں ہے "ویضحیٰ بالحجاء والخصي" در اصل جانوروں میں آختہ ہونا عیب نہیں، کیونکہ آختہ جانوروں کا گوشت زیادہ لذیذ اور خوش ذائقہ ہوتا ہے، اور اس میں بدبو نہیں ہوتی، تاجروں کے یہاں بھی خصی جانوروں کی قیمت زیادہ ہوتی ہے، جانوروں میں ایسی قدرتی اور مصنوعی تبدیلی قربانی میں رُکاوٹ ہے، جوان کے حق میں عیب شمار کیا جاتا ہو، بلکہ امام ابو حنیفہؒ سے منقول ہے کہ آختہ جانور کی قربانی بہتر ہے اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دو خصی مینڈوں کی قربانی کرنا ثابت ہے۔ (کتاب الفتاویٰ، جلد:۴)

پالتو اور جنگلی جانور کے اختلاط سے پیدا جانور کی قربانی: حدیث میں قربانی کے لیے جن جانوروں کا ذکر آیا ہے وہ سب پالتو جانور ہیں، نہ کہ جنگلی۔ اس لئے قربانی صرف پالتو جانوروں ہی کی ہوسکتی ہے۔ اگر پالتو اور جنگلی جانور کے اختلاط سے (آج کل نباتات کی طرح جانوروں میں دو الگ الگ جنس کے جانوروں کے اختلاط سے نئے قسم کا جانور پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے) بچہ پیدا ہو تو ماں کا اعتبار ہوگا، اگر ماں پالتو جانور کے قبیل سے ہے، جس کی قربانی کی اجازت حدیثوں سے ثابت ہے، تو اس کی قربانی درست ہوگی، ورنہ نہیں، چنانچہ ہرن نر ہو اور بکری مادہ، تو ایسے جانور کی قربانی درست ہوگی، اگر صورت اسکے برعکس ہو تو اس کی قربانی درست نہیں۔(تفصیل کے لئے الفتاویٰ الہندیہ، جلد۵، صفحہ۲۹۷ دیکھئے)۔

بقر عید کے دن قربانی کے گوشت سے کھانے کا آغاز: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک بقرعید کے دن نماز سے پہلے کھانے کا نہیں تھا، بلکہ نماز کے بعد آپ ﷺ قربانی کا گوشت تناول فرماتے تھے، اس لئے جو شخص دس ذی الحجہ کو قربانی کر رہا ہو تو اس کے لئے مستحب ہے کہ اس روز قربانی کے گوشت سے کھانے کا آغاز کرے، لیکن یہ حکم استحبابی ہے وجوبی نہیں۔

قرض لے کر قربانی کرنا:

اگر کسی شخص پر اپنی املاک کے لحاظ سے قربانی واجب ہو اور اس کے قبضہ میں گھریلو سامان اتنی قیمت کا موجود ہو جس سے قربانی کی جاسکتی ہے تو فقہاء نے ایسے شخص کو بھی قربانی کا حکم دیا ہے۔ فقہاء لکھتے ہیں اگر کوئی شخص گھریلو سامان جیسے فرنیچر، برتن وغیرہ فروخت نہیں کرنا چاہتا تو اس پر واجب ہے کہ قرض لے کر قربانی کرے، جیسا کہ اپنی دوسری ضروریات کے لیے قرض لیتا ہے۔

میت کے لئے صدقہ افضل ہے یا قربانی:

قربانی کے دنوں میں میت کے ایصال ثواب کے لئے پیسہ وغیرہ صدقہ کرنے سے قربانی کرنا افضل ہے اور اس کے ثواب کو میت کو پہونچانا افضل ہے، کیونکہ صدقہ، خیرات میں فقط مال کا ادا کرنا ہے اور قربانی میں مال کا ادا کرنا بھی اور فدا کرنا بھی یعنی دو مقصد پائے جاتے ہیں۔(فتاویٰ رحیمیہ، جلد دوم، صفحہ۸۷)۔

بانجھ جانور کی قربانی کا حکم:

بانجھ جانور کی قربانی جائز ہے، منع نہیں ہے، ممانعت کا حکم نظر سے نہیں گزرا، بانجھ ہونا قربانی کے لیے عیب نہیں ہے۔ جس طرح جانور کا خصّی ہونا اور جفتی سے عاجز ہونا قربانی کے لیے عیب نہیں ہے۔ بانجھ جانور جس کے بچہ نہ ہوتے ہوں اکثر لحیم وشحیم (خوب موٹا تازہ) ہوتا ہے، گوشت بھی عمدہ ہوتا ہے، بڑی عمر کی وجہ سے بچہ نہ ہو تو اس کی قربانی جائز ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ، جلد دوم، صفحہ۹۱)۔

عورت کا مہر اور اس کی قربانی:

ایک عورت مالک نصاب نہیں، لیکن اس کا مہر نصاب سے زیادہ شوہر کے ذمہ ہے جو ابھی نہیں مل سکا ہے تو عورت اُس مہر کی وجہ سے مالدار یعنی صاحب نصاب شمار نہ ہوگی اور اُس پر قربانی واجب نہ ہوگی۔ (فتاویٰ ہندیہ، جلد۵، صفحہ۲۹۳)۔

صاحب نصاب کا مرحوم کی طرف سے قربانی کرنا: اگر کوئی شخص (صاحب نصاب) اپنے مال سے میت کی جانب سے قربانی کرتا ہے، اگر خود اس پر قربانی واجب تھی تو یہ قربانی اس کی طرف سے ہوجائے گی اور میت کو قربانی کا ثواب نہ ملے گا، اور اگر اُس پر قربانی واجب نہ تھی، یا اپنی قربانی جدا کر چکا تھا تو میت کی طرف سے قربانی درست ہو جائے گی یعنی مردہ کو قربانی کا ثواب مل جائے گا۔ (کفایت المفتی، جلد:۸، صفحہ:۲۰۵)

اگر قربانی کرنے والے کی وفات ہو جائے: اگر کوئی صاحب نصاب قربانی کے ایام میں انتقال کر جائے تو اس سے قربانی کا وجوب ساقط ہو جاتا ہے اگر مرحوم نے قربانی کے لیے بکرا خرید کر رکھا تھا تو بکرا مرحوم کے ترکہ میں شامل ہو جائے گا، ، ورثاء اس کے حقدار ہونگے، اب ورثاء چاہیں تو اس کی قربانی مرحوم کے ایصال ثواب کے لئے کر سکتے ہیں، واجب نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ایک دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اگر سات افراد نے شریک ہوکر ایک گائے (یا کوئی بڑا جانور) قربانی کے لیے خریدا، اور قربانی سے پہلے اُن میں سے ایک شخص مر گیا مگر مردہ کے ورثاء نے ان شرکاء کو اجازت دے دی کہ تم اس کی (میت کی) اور اپنی طرف سے قربانی کرو، پس اگر وہ ان کی اجازت سے مردہ اور اپنی طرف سے قربانی کریں تو درست ہوگی اور سب کی قربانی ہو جائے گی، اور اگر اُس مردہ کے ورثاء کی اجازت کے بغیر قربانی کریں تو درست نہ ہوگی اور کسی کی بھی قربانی ادا نہ ہوگی۔ (خلاصۃ المسائل صفحہ ۱۱۶، عالمگیری جلد:۶، صفحہ۲۹۳)۔

قربانی کے بدلے میں صدقہ و خیرات:

اگر قربانی کے دن گذر گئے، ناواقفیت یا غفلت یا کسی عذر سے قربانی نہیں کر سکا تو قربانی کی قیمت فقراء و مساکین پر صدقہ کرنا واجب ہے لیکن قربانی کے تین دنوں میں جانوروں کی قیمت صدقہ کر دینے سے یہ واجب ادا نہ ہوگا، ہمیشہ گنہگار رہوگا، کیونکہ قربانی ایک مستقل عبادت ہے جیسے نماز پڑھنے سے روزہ اور روزہ رکھنے سے نماز نہیں ہوتی، زکوٰۃ ادا کرنے سے حج ادا نہیں ہوتا، ایسے ہی صدقہ کرنے سے قربانی ادا نہیں ہوتی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور تعامل اور پھر تعاملِ صحابہ اس پر شاہد نہیں ہیں۔ (جواہر الفقہ، جلد اول، صفحہ۴۴۸)۔

گائے کی قربانی:

ہندوستان جیسے ملک میں جہاں گاؤ کشی قانوناً ممنوع ہے اور برادران وطن کے لیے گائے کی قربانی یا ذبح گاؤ ایک انتہائی حسّاس اور جذباتی مسئلہ کی حیثیت رکھتا ہے، تو کیا مسلمانوں کو اس کا تسلیم کر لینا اور اس سے رک جانا شرعاً درست ہوگا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اصولی طور پر اس کو ممنوع تسلیم کر لینا تو قطعاً درست نہیں ہے، کیونکہ اگر یہاں اس پر پابندی تسلیم کر لی جائے تو نہ صرف یہ کہ اسلام کے ایک شعار کو کھونا ہوگا بلکہ غیر اسلامی شعار کو قبول کر لینے کے مترادف ہوگا۔ جب کہ اسلام شعائر دین کے سلسلے میں بہت غیّور اور حسّاس ہے اور ادنیٰ درجہ کی مداہنت گوارا نہیں کرتا، پھر ایسا کرنے سے (مان لینے سے) ایک ایسی چیز پر نسخ پھیر دینا لازم آئے گا جس کی نہ صرف یہ کہ اسلام نے اجازت دی ہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اس پر عمل فرمایا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے بھی یہ درست نہیں۔

البتہ فتنہ کے اندیشے سے وقتی طور پر اس سے رکنا مصلحتاً درست ہوگا جب کہ اس کی وجہ سے فساد پھوٹ پڑنے کا اندیشہ ہو، لیکن اس کی حیثیت جزوی اور انفرادی ہے۔

حاجیوں پر بقر عید کی قربانی: اگر کوئی شخص ایسے وقت مکہ مکرمہ پہونچے کہ ایام حج شروع ہونے میں پندرہ دن سے کم کا عرصہ ہو، یعنی ۸ر ذی الحجہ سے ۱۴ر دنوں پہلے یا اس سے کم دن باقی تھے کہ وہ مکہ آیا تو اب وہ مسافر ہے، اس لئے اس پر بقر عید والی قربانی واجب نہیں، اس پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے، کیونکہ وہ مسافر ہے اور قربانی مسافر پر واجب نہیں ہوتی، جو حاجی ۸ر ذی الحجہ سے پندرہ دن پہلے مکہ مکرمہ پہونچ جائے وہ مقیم ہے، تو کیا ایسے شخص پر بقر عید کی قربانی بھی واجب رہے گی؟ اس سلسلے میں فقہاء احناف سے دونوں طرح کی باتیں منقول ہیں۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ حاجی پر مطلقاً بقر عید والی قربانی واجب نہیں، اور بعض فقہاء کے نزدیک جو حاجی مقیم ہو، تو اقامت کی وجہ سے اس پر قربانی واجب ہے، یہ دوسری رائے زیادہ احتیاط پر مبنی ہے، اس لئے اس پر عمل ہونا چاہئے۔ علامہ شامیؒ نے قربانی کے بیان (کتاب الاضحیۃ) میں اس پر روشنی ڈالی ہے، پس جو لوگ مکہ میں ایام حج سے پندرہ دنوں پہلے پہونچ گئے ہوں تو ان پر حج کی قربانی کے علاوہ بقر عید کی قربانی بھی واجب ہوگی، البتہ حج کی قربانی تو حدودِ حرم ہی میں دی جاسکتی ہے لیکن بقر عید کی قربانی کے لئے ایسی کچھ شرط نہیں، اپنے وطن میں بھی قربانی دے سکتا ہے۔ (کتاب الفتاویٰ، جلد:۴، صفحہ ۱۳۴-۱۳۵)

کیا قربانی کے وقت میں مقام قربانی کا اعتبار ہوگا؟ قربانی کے وقت کے سلسلے میں دو باتیں خاص طور پر ذہن میں رکھنے کی ہیں: اول یہ کہ قربانی کے درست ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ جس کی طرف سے قربانی ہو رہی ہے، وہ نماز عید ادا کر چکا ہو، بلکہ اعتبار قربانی کی جگہ کا ہے۔ جس جگہ قربانی ہو رہی ہے، وہاں نماز عید ہو چکی ہو، تو یہ کافی ہے، اور اسی کا اعتبار ہے۔ دوسرے شہر میں کسی بھی ایک جگہ نماز ہو چکی ہو تو پورے شہر میں قربانی درست ہے، خواہ ابھی دوسری جگہ نماز نہ ہوئی ہو، اور قربانی کرنے والے نے خود نماز ادا نہ کی ہو۔

نذر مانی گئی قربانی کے گوشت کا حکم: اگر کوئی شخص یہ نذر مانے کہ میں صحت مند ہو گیا تو بکرا ذبح کروں گا اور قربانی کروں گا تو یہ نذر کی قربانی ہے، اس کا کھانا ان ہی لوگوں کے لئے جائز ہے جن کے لئے زکوٰۃ جائز ہو، جو رشتہ دار اس کی زکوٰۃ نہیں لے سکتے، ان کے لئے اس قربانی میں سے کھانا جائز نہیں ہوگا، اور اگر پہلے سے اس قسم کی نذر نہیں مانی تھی، بلکہ صحت ہونے کے بعد بطور شکرانہ کے قربانی کر دی تو اس کا وہی حکم ہے جو بقر عید کی قربانی کا ہے، یعنی اس میں سے خود بھی کھا سکتے ہیں، عزیزوں اقارب کو بھی دے سکتے ہیں۔

کب قربانی کا گوشت صدقہ کرنا واجب ہے؟ فقہاء نے چند صورتیں ایسی لکھی ہیں جن میں قربانی کا گوشت نہیں کھایا جاسکتا بلکہ گوشت کو صدقہ کرنا واجب ہوتا ہے: (۱) اگر قربانی کی نذر مانی گئی ہو۔ (۲) ایام قربانی میں باوجود واجب ہونے کے قربانی نہ کر سکا، اب بعد میں اس کی تلافی کے طور پر جو جانور خرید لیا جائے، اسے صدقہ کر دینا چاہئے، اگر ذبح کیا جائے تو اس کی تمام اشیاء کو صدقہ کر دینا واجب ہوگا۔ (۳) مرنے والے نے اپنے مال میں سے قربانی کی وصیت کی ہو اور اسی کے مال سے وہ وصیت پوری کی جائے، تو اس گوشت کو بھی صدقہ کر دینا واجب ہے۔ (۴) قربانی کا جانور خرید لیا گیا، اس جانور نے بچہ کو جنم دیا تو اس کو بھی صدقہ کرنا واجب ہے۔ (۵) ایک جانور میں سات افراد شریک تھے، ان میں سے ایک شخص کی نیت پچھلے سال کی قربانی کی قضا کرنا تھا، اب چونکہ قضا کی قربانی میں صدقہ کرنا واجب ہوتا ہے، اس لئے اس پورے جانور کو صدقہ کرنا واجب ہو جائے گا۔ (کتاب الفتاویٰ، جلد:۴، صفحہ ۱۴۷-۱۴۸)

جائے قیام کی بجائے دوسری جگہ قربانی: بہتر تو یہ ہے کہ آدمی جہاں رہتا ہو وہیں قربانی

دے، لیکن دوسری جگہ زیادہ مستحق لوگ رہتے ہوں تو وہاں قربانی دینے میں بھی کوئی حرج نہیں، اگرچہ دونوں جگہ جانوروں کی قیمت میں فرق ہو۔

قربانی کی دعا کسی نے پڑھی اور ذبح کسی اور نے کیا: کسی کی طرف سے قربانی کرنے کے لئے زبان سے نیت کرنا ضروری نہیں، دل سے ارادہ کر لینا بھی کافی ہے، لہٰذا اگر ذبح کرنے والے نے دل سے قربانی کی نیت کی اور بسم اللہ کہہ کر جانور ذبح کر دیا تو قربانی درست ہو جائے گی، ہاں! یہ درست نہیں کہ ایک شخص بسم اللہ پڑھے اور دوسرا ذبح کرے، خود ذبح کرنے والے کے لئے بسم اللہ کہنا ضروری ہے، قربانی کے سلسلے میں بھی بہتر یہی ہے کہ جانور ذبح کرنے والا قربانی کی دعا پڑھے۔ (واللہ اعلم)۔

چوری کے جانور کی قربانی:
کسی شخص نے اگر چوری کرنے والے سے جانور خریدا تو اس کی قربانی جائز نہیں، دوسرا جانور خرید کر قربانی کرنی ہوگی، البتہ اگر ذبح کے بعد اصل مالک اجازت دے دے تو گوشت کھانا جائز ہے۔

کانجی ہاؤس سے لئے جانور کی قربانی:
کانجی ہاؤس سے خریدے گئے جانور کی قربانی درست ہے البتہ عرفاً بدنامی کا سبب ہے اس لئے بلاضرورت بالخصوص مقتداء کے لئے زیبا نہیں ہے۔ (امداد الفتاویٰ، جلد ۳، صفحہ ۵۴۱)

قربانی کا جانور خرید کر نفع سے بیچنا:
قربانی کے جانور کو خرید کر نفع سے بیچنا بہتر نہیں ہے، اگر فروخت کر کے دوسرا کم قیمت کا خریدے تو جو نفع حاصل ہوا ہے اسے بھی خیرات کر دینا چاہئے۔ (کفایت المفتی، ج:۸، ص۱۹۷)

بھول کر ایک دوسرے کی قربانی کر دیے: اگر دو شخصوں نے دو جانوروں (بکریوں) کو قربانی کے ارادے سے خریدا اور بھول کر ایک نے دوسرے کی بکری کو ذبح کر ڈالا تو دونوں کی قربانیاں درست ہوں گی اور کسی پر بدلہ دینا واجب نہ ہوگا۔

ایک شخص پر کتنی قربانی واجب ہے؟ صاحب نصاب شخص پر ایک ہی قربانی واجب ہوتی ہے، زیادہ نہیں، خواہ وہ شخص کتنا ہی مالدار کیوں نہ ہو، ایک شخص کی ملک میں کتنے ہی نصاب جمع ہو جائیں، اس پر ایک ہی قربانی واجب ہوگی۔ (کفایت المفتی، ج:۸، ص:۱۷۸)۔

قربانی میں شرکت کا افضل طریقہ:
گائے (بڑے جانور) میں شریک ہونے والے خریدنے سے پہلے شریک ہو جائیں اور پھر جانور خریدیں تو یہ احوط (زیادہ احتیاط) اور افضل ہے اور اسی حکم میں یہ صورت بھی ہے کہ خریدنے والا اس نیت سے خریدے کہ ایک حصّہ یا دو حصّے میں اپنی قربانی کے لئے رکھوں گا اور باقی حصّوں میں دوسروں کو شریک کرلوں گا، یہ بھی جائز ہے، لیکن اگر اس نے بغیر کسی نیت کے خرید لیا اور بعد میں دوسروں کو شریک کرلیا تو اس کے جواز میں اختلاف ہے، لیکن راجح جواز ہے۔ (کفایت المفتی، جلد:۸، صفحہ ۱۸۸)۔

شرکت سے علیٰحدہ ہو جانے کا حکم:
قربانی کے جانور میں اگر کوئی ایسا شخص شریک تھا جس پر قربانی واجب تھی اور پھر ذبح سے پہلے شرکت سے علیٰحدہ ہو گیا اور دوسرا آدمی اس کی جگہ شریک ہو گیا تو قربانی ہو جائے گی، اور جس پر قربانی واجب نہ تھی، وہ اگر ذبح کرنے سے علیٰحدہ ہو جائے تو اس پر قربانی واجب رہ گئی اور اس جانور کے دوسرے شرکاء کی قربانی بھی درست نہ ہوگی۔ (کفایت المفتی، ج:۸، ص:۱۹۰)۔

نجاست خور جانور کی قربانی:
اگر کوئی جانور غلاظت کھاتا ہو تو اس کے باندھنے سے پہلے اس کی قربانی جائز نہیں ہے۔ جب اس کو چند روز باندھ دیا گیا جس سے وہ ناپاکی نہ کھا سکے تو اس کی قربانی جائز ہے، اگر اونٹ ہے تو اس کو چالیس روز۔ گائے، بھینس، بیل وغیرہ کو بیس روز اور بکرا بکری کو دس دن بند رکھا جائے۔ (شامی، جلد:۵، صفحہ ۲۰۷)

☆☆☆

اسلامی تعلیمات

ماحولیات کا تحفظ اور اسلام

مفتی تنظیم عالم قاسمی (استاذ حدیث دارالعلوم سبیل السلام، حیدرآباد)
mdtanzimalam@gmail.com

جن مسائل سے آج دنیا دوچار ہے ان میں ماحولیات کا مسئلہ بہت اہم اور لوگوں کے لئے مرکز توجہ بنا ہوا ہے۔ بین الاقوامی تنظیمیں اور مختلف رفاہی ادارے ماحولیات کے مسائل کو حل کرنے میں مسلسل لگے ہوئے ہیں۔ دنیا کے مختلف حصوں میں کانفرنسیں، سمینار، سمپوزیم اور اجتماعات منعقد ہو رہے ہیں قراردادیں منظور کی جارہی ہیں، عالمی سطح پر سفارشات کا سلسلہ جاری ہے مگر اس کے باوجود ماحولیات کی آلودگی ساری دنیا کے لئے ایک چیلنج بنا ہوا ہے۔ روز بروز یہ مسئلہ بھیانک صورت حال اختیار کرتا جارہا ہے اور اب یہ اندیشہ ہونے لگا ہے کہ اگر اجتماعی طور پر ماحولیات کے تحفظ کے لئے منصوبہ بند اور مؤثر طریقہ کار اختیار نہیں کیا گیا تو ساری دنیا تباہی اور ہلاکت میں مبتلا ہوسکتی ہے اور نہ صرف انسان بلکہ تمام حیوانات، چرند و پرند اور نباتات کو عظیم اور ناقابل تلافی نقصان لاحق ہوسکتا ہے۔

اس موقع پر دیکھنا یہ ہے کہ اسلام نے ماحولیات کی حفاظت کے لئے کیا رہنمائی کی ہے اور ماحولیاتی کثافت کے نتیجے میں جو مسائل پیدا ہو رہے ہیں فقہ اسلامی نے ان کا کیا حل پیش کیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، قیامت تک جیسا بھی انقلاب برپا ہو اور جیسی بھی تبدیلی آئے اسلامی شریعت میں کامیاب اور اطمینان بخش حل پیش کیا گیا ہے، چنانچہ ماحولیات سے متعلق بھی مکمل رہنمائی اور اصول وضوابط قرآن وحدیث میں موجود ہیں، اگر ان شرعی ہدایات کے دائرے میں رہتے ہوئے اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ان موجودہ ماحولیاتی مشکلات سے لوگوں کو نجات نہ ملے اور دنیا آلودگی و کثافت سے پاک نہ ہو۔ اہل علم اور ارباب تحقیق کے مطابق تقریبا 750 آیات قرآنی ایسی ہیں جن کا تعلق براہ راست یا بالواسطہ ماحولیات سے ہے، جن میں مسلمانوں کو پابند بنایا گیا ہے کہ وہ کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے فضا اور ماحول آلودہ ہو اور دوسرے کسی جاندار کے لئے وہ مضر ثابت ہو۔ رسول اکرم ﷺ نے بھی مختلف نوعیّتوں سے اپنی امت کو ایسی ہدایات دی ہیں جن کا تعلق ماحولیات کے تحفظ سے ہے، اس قدر اہتمام کی وجہ یہ ہے کہ سارے انسانوں اور جانداروں یہاں تک کہ نباتات کی بقا کی بنیاد بھی اسی ماحولیات کے تحفظ پر ہے، اگر صاف ستھرا ماحول میسر نہ ہو تو مختلف امراض جنم لیتے ہیں اور اس کی وبا سارے انسانوں اور حیوانوں کو اپنے لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ اللہ تعالی نے دنیا کے نظام کو نہایت معتدل، متوازن اور مناسب انداز میں رکھا ہے اور اسی متوازن نظام سے بہتر اور عمدہ ماحول تیار ہوتا ہے، اگر اس میں تھوڑا سا بھی خلل ڈال دیا

جائے اور قانون قدرت سے بغاوت کر لی جائے تو نظام درہم برہم ہو جائے گا اور زمین سے چین وسکون ختم ہو کر مختلف مسائل پیدا ہو جائیں گے، مثال کے طور پر سورج اللہ کی طرف سے محدود مقدار میں روشنی اور گرمی فراہم کرنے پر مامور ہے اس سے لوگ بھر پور استفادہ کر رہے ہیں، اگر اس متوازن نظام میں تھوڑا سا خلل پیدا ہو جائے کہ سورج ابھی جتنی شعاعیں زمین پر بھیج رہا ہے اس میں نصف کو کم کر دیا جائے تو زمین کی ساری چیزیں منجمد ہو جائیں گی اور اگر اس میں اضافہ کر دیا جائے تو ساری زمین جل کر خاکستر ہو جائے گی پھر اس میں کسی متنفس کا باقی رہنا ممکن نہیں رہے گا۔

سمندر، دریا، جھیل، پہاڑ، صحرا، باغات، جنگلات، نباتات، پرندے، جانور، حشرات اور دوسری تمام مخلوقات ایک خاص انداز میں پیدا کی گئی ہیں اور جس مقصد کے لئے ان کو وجود بخشا گیا، اسے پورا کر رہی ہیں، اس طرح خدائی نظام کامل اور مبنی بر حکمت ہے اور اسی حکیمانہ نظام سے حیات مربوط ہے، اس لئے سارے انسانوں کی ذمہ داری ہے کہ ان قدرتی وسائل کا تحفظ کریں اور ان میں کوئی ایسا عمل نہ کریں جس سے ان وسائل کا بے جا استعمال ہوتا ہو، ورنہ توازن بکھر جائے گا اور دنیا کا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ چنانچہ موجودہ ماحولیاتی مسائل قدرتی نظام میں خرد برد کرنے کے سبب ہی پیدا ہوے ہیں۔ صنعتی سرگرمیوں اور جدید ٹکنالوجی کے بے جا استعمال نے قدرتی ماحول کو متاثر کیا اور اس میں ایسی تبدیلی پیدا ہوئی جو تمام جانداروں کے لئے نہایت نقصاندہ ہے، جیسے بڑی بڑی کمپنیاں اور صنعتی ادارے قائم کرنے اور شہر وبستی کو خوبصورت بنانے اور اس کی توسیع کے لئے جنگلات کی صفائی عمل میں لائی گئی، اندھا دھند درخت کاٹے گئے، علاقوں کو جنگل سے پاک کیا گیا مگر اس کا نتیجہ بہت تباہ کن ثابت ہوا، اللہ تعالی نے ان درختوں میں فضائی اور صوتی آلودگی جذب کرنے کی صلاحیت رکھی ہے، اس سے گندی آب وہوا ختم ہو کر صاف ستھری فضا میسر ہوتی ہے اور پھر اس سے وافر مقدار میں آکسیجن بھی تیار ملتا ہے جو انسان کی بقا کی بنیاد ہے۔ اسی لئے شریعت اسلامی نے کھیتی باڑی کرنے، پیڑ پودے لگانے اور بنجر زمین کو قابل کاشت بنانے کا حکم دیا ہے اور کوئی ایسا عمل کرنے سے روکا گیا ہے جس سے لہلاتی ہوئی کھیتی اور ہرے بھرے درخت کو نقصان پہنچے، اس طرح کے عمل کو قرآن نے فساد سے تعبیر کیا ہے۔ شجر کاری اور پیڑ پودا لگانے کی اہمیت اس سے واضح ہوتی ہے کہ ایک موقع پر رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر قیامت آجائے اور تم میں سے کسی کے ہاتھ میں پودا ہو اور قیامت آنے سے پہلے پہلے وہ پودا لگا سکتا ہو تو اسے ایسا ضرور کر لینا چاہئے حدیث کے الفاظ یہ ہیں :

ان قامت الساعة و بيدا حدكم فسيلة فا ن استطاع ان لا يقوم حتى يغرس فليفعل (**مسند احمد ۱۲۵۱۲**)۔

ماحولیاتی مسائل سے نجات پانے کے لئے شجر کاری کو عام کرنے اور جنگلات اور درختوں کی بے جا کٹائی پر پابندی لگانے کی ضرورت ہے۔

انسانی مداخلت سے قدرتی نظام کے توازن بگڑنے کی دوسری مثال یہ ہے کہ اٹھارہویں صدی میں صنعتی انقلاب کے بعد جو مشینیں ایجاد ہوئیں، کارخانے بنے اور مختلف مصنوعات کی ایجاد عمل میں آئی، ان مشینوں میں بھاری مقدار میں کوئلہ، پٹرول، ڈیزل استعمال کیا جاتا ہے، اس سے اٹھنے والا دھواں فضا کو آلودہ اور زہر ناک بنا دیتا ہے جس سے انسانی صحت متاثر ہوتی ہے، مختلف بیماریاں جنم لیتی ہیں، کھلی فضا میں بھی گھٹن کا احساس ہوتا ہے اور پھر ان فیکٹریوں کے فضلات نالیوں کے ذریعے دریا و سمندروں میں پہنچتی ہیں جن کے سبب پانی کا بہاؤ

اور فطری رنگ متاثر ہوتا ہے، اس میں کثافت پیدا ہوتی ہے اور یہی کثافت اس سے سیراب ہونے والے چرند و پرند، کھیتی، غلے سبزیاں پھل پھول میں سرایت کرتی ہے، اسی طرح ان کمپنیوں سے نکلنے والے کوڑا کرکٹ کا ان علاقوں میں ایک انبار لگ جاتا ہے جس سے زمینی آلودگی پھیلتی ہے اور رفتہ رفتہ یہی آبی اور فضائی آلودگی کا سبب بن جاتی ہے پھر اس سے تنفس، جلد، قلب اور پھیپھڑے وغیرہ کے متعدد مہلک امراض پیدا ہوتے ہیں، ان ہی آلودگیوں کے سبب آج کل مریضوں کی کثرت ہوگئی ہے اور کوئی ایسا ہاسپٹل نہیں ہے جہاں مریضوں کی بہتات نہ ہو۔

اسلام نے اس طرح کی کثافتوں سے گردوپیش اور ماحول کو پاک رکھنے کی تاکید کی ہے، راستے اور عام گذرگاہوں میں تھوکنے اور قضائے حاجت سے اسی لئے منع کیا گیا ہے تاکہ اس سے آلودگی نہ پھیلے اور آبادی اس کے مضر اثرات سے محفوظ رہ سکے۔ اپنے جسم کپڑا اور برتنے والی چیزوں کو صاف ستھرا رکھنے کے ساتھ اپنے گھر بار، کمرہ، رہائش اور آنگن وغیرہ کو بھی صاف ستھرا رکھنے کی تعلیم دی گئی ہے، ایک موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اللہ طیب ہے، طیب وعمدہ کو پسند کرتا ہے، نظیف ہے صاف ستھرے کو پسند کرتا ہے، کریم ہے کرم ومہربانی کو پسند کرتا ہے جواد ہے، جود وسخاوت کو پسند کرتا ہے، تو اپنے صحن کو صاف کرو اور یہود کی مشابہت اختیار مت کرو۔ (ترمذی حدیث نمبر ۲۷۲۳)۔

ایک دوسرے موقع پر آپ ﷺ نے یہ ہدایت فرمائی:
''لعنت کے مستحق بننے کے تین کام سے بچو، پانی لینے کی جگہ پر، راستوں پر اور سائے کی جگہ میں بول و براز کرنے سے،، (سنن ابوداؤد حدیث نمبر ۲۴)۔

ان ہی احادیث اور نصوص شرعیہ کی بنیاد پر حضرات فقہاء نے ایسے تمام امور سے منع کیا ہے جن سے آلودگی اور کثافت پیدا ہوتی ہے، جیسے راستوں اور آبادیوں کے درمیان قضاء حاجت کرنا، گھر سے باہر کھلی ہوئی نالیاں نکالنا، صاف جمع شدہ پانی میں گندگیوں کا اخراج، آبادی کے درمیان بھٹی اور چمنیاں قائم کرنا، گاڑیوں میں کراسن تیل کا استعمال، بے جا طور پر لاؤڈ اسپیکر کا استعمال وغیرہ۔

پانی انسان کی بنیادی ضروت ہے۔ گندے اور آلودہ پانی سے جسم میں طرح طرح کے امراض پیدا ہوتے ہیں اور ماحول بہت بری طرح متاثر ہوتا ہے، صحت مند ماحول اور معاشرہ کے لئے صاف ستھرے پانی کا ہونا ضروری ہے، اسی لئے فقہ اسلامی نے پانی کو ہر ممکن آلودگی سے بچانے کی تاکید کی ہے چنانچہ احادیث مبارکہ میں پانی میں بول و براز کرنے، اس میں نجاست اور گندگی ڈالنے بلکہ اس میں تھوکنے سے بھی منع کیا گیا ہے کیوں کہ اس سے پانی میں کثافت پیدا ہوتی ہے، اسی طرح غبار اور کیڑے مکوڑے سے محفوظ رکھنے اور پینے یا پکانے کے پانی کو آلودہ ہونے سے بچانے کے لئے برتنوں کو کسی چیز سے ڈھک دینے اور سونے پہلے اس کا اہتمام کرنے کی تعلیم دی گئی ہے کیوں کہ اس سے صحت انسانی کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے اور یہ لوگوں کے لئے تباہی اور نقصان کا باعث بن سکتا ہے۔۔ ملٹی نیشنل کمپنیوں اور صنعتی اداروں کو بھی چاہئے کہ وہ آلودگیوں کو جذب اور تحلیل کرنے کے وسائل استعمال کریں اور ایسا طریقہ اختیار کریں جس سے آلودگی اور کثافت کم سے کم پیدا ہوتی ہے تاکہ معاشرہ اور سماج کو مہلک امراض سے محفوظ رکھا جاسکے۔

آج کل موٹر گاڑیوں اور دخانی سواریوں کی کثرت نے بھی ماحول اور معاشرے میں کثافت اور آلودگی پید کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ پیسے بٹورنے کے جذبے سے

سستی اور کم قیمت کی چیزیں گاڑی میں لگائی جاتی ہیں جس سے دھواں زیادہ اٹھتا ہے جو بسا اوقات غیر محسوس ہوتا ہے مگر اس کی زہرناکی میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا، پھر ڈیزل اور پٹرول کی جگہ کیروسن تیل کے استعمال نے ان خطرات میں مزید اضافہ کر دیا ہے، اس سے شہر قصبہ اور دیہات تک آلودہ ہو رہا ہے اس سے جلد، قلب اور پھیپھڑوں کے امراض پیدا ہو رہے ہیں، پھر بے جا ہارن کے استعمال نے صوتی آلودگی میں بھی بے تحاشہ اضافہ کیا ہے، اس سے سر کا درد، خون کے نظام میں خرابی، اعصابی بیماریاں، قوت ہاضمہ میں بگاڑ اور کئی دوسری جسمانی بیماریاں پیدا ہوجاتی ہیں، اس لئے اسلام نے صوتی آلودگی کے تمام اسباب پر امتناع عائد کر دیا ہے، قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہوئے بھی آواز کو معتدل رکھنے کی تاکید کی۔ مساجد اور بازاروں میں شورو شغب سے پرہیز کرنے اور گدھوں کی طرح چیخنے چلانے سے منع کیا گیا ہے، ایک صحابی نے دوران سفر اللہ اکبر بلند آواز سے کہنا شروع کیا تو آپ ﷺ نے اس سے یہ کہتے ہوئے منع فرمایا کہ تم جس ذات کو پکار رہے ہو وہ بہری یا دور نہیں بلکہ وہ تم سے بہت قریب ہے۔

کثافت اور آلودگی کے پیدا کرنے میں مغربی طرز پر اسراف اور فضول خرچی کا بھی بڑا حصہ ہے، غذائی اشیاء تھوڑی مقدار میں استعمال کرنے کے بعد اسے کوڑا کرکٹ میں ڈال دیتے ہیں اور اسے اعلی تہذیب کا حصہ سمجھا جاتا ہے، بعض تحقیقاتی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ صنعتی ملکوں میں کوڑے دانوں میں غذائی اشیاء اتنی مقدار میں پھینکی جاتی ہیں کہ وہی قحط زدہ بعض ملکوں کی بھوک وافلاس سے دوچار پوری آبادی کے لئے کافی ہوسکتی ہے، اسراف کی یہ ذہنیت عام ہوتی جاری ہے' ہمارا ملک هندوستان بھی مغربی ممالک کے طرز پر رواں دواں ہے، اس کا اندازہ شادی بیاہ کے موقع پر کیا جاسکتا ہے، قرآن کریم نے اسراف اور فضول خرچی کرنے والوں کو شیطان کا بھائی قرار دیا ہے اور یہ تعلیم دی ہے کہ بقدر ضرورت ہی کسی چیز کا استعمال کیا جائے اور جہاں تک استعمال کیا جاسکتا ہے اس میں کوئی کمی یا کوتاہی نہ کی جائے یہاں تک کہ کھانے کے بعد انگلی اور برتن کو چاٹ کر صاف کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ شہروں کی بعض گلیوں میں کوڑا کرکٹ اور سڑے ہوئے غذائی اجناس اس طرح پھینکے رہتے ہیں کہ اس سے پوار ماحول متأثر ہوتا ہے، اس سے اٹھنے والا تعفن ساری آبادی کے لئے نہایت مہلک اور خطرناک ہوتا ہے۔

بہرحال ماحولیات کا تحفظ انسانی بقاء کے لئے از حد ضروری ہے، اللہ تعالی نے نظام کائنات کو معتدل اور متوازن پیدا کر کے انسانوں کے ہاتھ میں اسے دے دیا اور مختلف انداز میں انہیں اس بات سے آگاہ کر دیا کہ ماحول کو فطری حال پر باقی رکھنے میں تمہارے لئے اور دنیا کی تمام مخلوقات کے لئے خیر ہے اور اس میں کسی طرح کی تبدیلی تباہی اور ہلاکت کا سبب ہے، اس لئے سارے لوگوں کی انفرادی اور اجتماعی ذمے داری ہے کہ اپنی جان، مال و دولت اور نجی املاک کی طرح ماحولیات کا بھی تحفظ کریں اور ہر ممکن دنیا کو تمام طرح کی آلودگیوں اور کثافتوں سے پاک رکھنے کی کوشش کریں۔ قدرتی وسائل میں بے جا تصرف نہ کریں اور نہ انہیں ان مقاصد کے لئے استعمال کریں جن کے لئے وہ پیدا نہیں کئے گئے ہیں، اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو وہ اللہ کی نظر میں سخت مجرم اور لائق سزا ہے کہ اس نے دنیا کے فطری نظام میں خلل ڈال کر اس کو ہلاکت کی طرف ڈھکیل دیا ہے۔

☆☆☆

اسلامی تعلیمات

معذوروں اور ضعیفوں کے حقوق

حافظ کلیم اللہ عمری مدنی (استاذ ومفتی جامعہ دارالسلام، عمرآباد)

hskpbt.2009@gmail.com

مذاہب عالم اور ادیان سماویہ وکتب سماویہ(توراۃ وزبور وغیرہ) میں خواہ معذوروں اور اپاہجوں کے الفاظ نہ ملیں لیکن ان کی تعلیمات میں سائلین ،محرومین، مستضعفین وغیرہ کے الفاظ اور ان کے حقوق کا تذکرہ ملتا ہے' ان محرومین کی فلاح وبہبود اور دیکھ بھال کرنے اور ان کے ساتھ رعایت کرنے کا تذکرہ ضرور ملتا ہے۔کتب سماویہ یعنی توارت وانجیل میں ان معذوروں کی فلاح وبہبود سے متعلق تعلیمات موجود ہیں،حضرت عیسی علیہ السلام کا حکم الہی سے اندھوں کو بینائی بخشنا،اور کوڑھ کے مریضوں کوشفایاب کرنا ان کی تعلیمات کا عملی نمونہ ہے، یہ سلسلہ محمد ﷺ کی شریعت تک پہنچا یہاں تک قرآن کریم میں ان بے کسوں سے متعلق مختلف احکامات نازل ہوئے، کسی کی عزت ووقار کے مرتبے کا تعین سماجی یا معاشرتی حیثیت کو دیکھ کر نہ کیا جائے، بلکہ اس کے لئے ذاتی کردار و تقوی ،اصلاح طلبی اور نیکی کے جذبے کو معیار بنایا جائے، جسمانی کمزوری کی وجہ سے کسی کی عزت اور توقیر میں کوئی فرق ہرگز آنے نہ دیا جائے۔

دین اسلام میں خصوصا ضعیفوں اور بزرگوں کی خدمت، ان کا احترام اور ان کے ساتھ ہمدردی کرنے کو عبادات میں شمار کیا گیا' خود نبی کریم ﷺ کی عملی زندگی ایک نمونہ ہے' آپ نے ضعیفوں' بوڑھوں اور معذوروں کے ساتھ حسن سلوک کیا' یتیموں اور بے کسوں کو سہارا دیا' غریبوں کے ساتھ مشفقانہ برتاؤ کیا' معذوروں اور اپاہجوں کو جینا سکھایا' خودداری کا درس دیا' بھیک مانگنے کے مقابلہ میں عزت کی زندگی کا سلیقہ سکھایا، ان ضعیفوں کی تعظیم وتکریم کا سبق دیا، ارشاد نبوی ﷺ ہے ان **من اجلال اللہ اکرام ذی الشیبۃ المسلم (سنن ابی داؤد' ۴۸۴۳' حسنہ الالبانی)** یعنی اللہ تعالی کی عزت وتوقیر کا تقاضا ہے کہ بوڑھے (سفید بال والے) مسلمان کی عزت کی جائے۔

نبی کریم ﷺ نے خصوصا ضعیفوں اور ناداروں کے ساتھ حد درجہ کریمانہ اور فاضلانہ اخلاق کا مظاہرہ کیا، اصحاب صفہ جو کہ غریب صحابہ تھے، ان کا کوئی پرسان حال نہ تھا اللہ کے نبی ﷺ ان کے ساتھ پوری خیر خواہی فرماتے، ہمدردی کا اظہار فرماتے، کسی جگہ کھانے کی دعوت دی جاتی تو آپ میزبان سے اجازت طلب کرتے اور اصحاب صفہ کو بھی شریک فرماتے، ایک بار ایک صاحب کا گزر ہوا تو نبی کریم ﷺ نے صحابہ سے سوال کیا کہ اس شخص کے تعلق سے آپ لوگوں کی کیا رائے ہے؟ تو صحابہ نے جواب دیا کہ یہ شخص اس لائق ہے کہ وہ پیغام نکاح دے تو قبول کیا جائے، اگر سفارش کرے تو اس کی

سفارش قبول کی جائے، اور اگر کوئی بات کہے تو اس کی بات غور سے سنی جائے، تو نبی کریم ﷺ خاموش ہو گئے، اتنے میں ایک کم حیثیتوں کے مالک شخص کا گزر ہوا تو نبی کریم نے اس شخص سے متعلق سوال کیا کہ ان کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ یہ شخص اس لائق ہے کہ وہ پیغام نکاح دے تو قبول نہ کیا جائے، اگر سفارش کرے تو اس کی سفارش قبول نہ کی جائے، اور اگر کوئی بات کہے تو اس کی بات غور سے نہ سنی جائے، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ (**هــذا خير من مل ء الارض مثل هذا**) ثانی الذکر روئے زمین کے سارے لوگوں سے بہتر ہے (بخاری)۔

نبی اکرم ﷺ نے ضعیفوں اور بے کسوں کے ساتھ جو خیر خواہی اور خبر گیری کی، اس کی کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، لیکن بطور مثال ایک کا تذکرہ ذیل میں دینا مناسب سمجھتا ہوں، حضرت ابو ہریرہؓ سے اس عورت کے بارے میں جو مسجد میں جھاڑو دیا کرتی تھی، روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس کے متعلق صحابہ کرامؓ سے دریافت فرمایا تو صحابہ نے جواب دیا کہ وہ فوت ہو چکی ہے آپ نے فرمایا تم نے مجھے اطلاع کیوں نہ دی؟ گویا انہوں نے اس کے معاملہ وفات کو معمولی خیال کیا۔ آپ نے فرمایا مجھے اس کی قبر کا راستہ بتاؤ، انہوں نے آپ کو اس کی قبر بتا دی، آپ نے وہاں جا کر قبر پر نماز پڑھی۔ (بخاری ومسلم) مذکورہ حدیث سے نبی کریم ﷺ کی غریبوں سے محبت کا ثبوت ملتا ہے، نیز نبی کریم ﷺ کو اپنے کارکن مرد وعورت دونوں سے کس قدر تعلق اور لگاؤ تھا، اس پر یہ حدیث اہم دلیل ہے۔

ضعیفوں میں سے غلامی بھی قابل ذکر ہے، اسلام سے قبل غلامی کا بدترین دور تھا، انسان جانوروں کی طرح خریدا اور بیچا جاتا تھا، اسے کوئی حق حاصل نہیں تھا، نہ مالی، دینی، سیاسی اور نہ معاشرتی کوئی حق میسر تھا، مالک کے رحم وکرم پر زندگی گزرتی تھی، نبوت وبعثت کے بعد نبی کریم ﷺ نے ان غلاموں کی آزادی کی پوری کوشش فرمائی، بہت سارے معاملات میں ان کی آزادی کو کفارہ میں شامل فرمایا جیسے ظہار، اور قسم کا کفارہ وغیرہ۔ بلکہ انہیں آزاد کرنے کی فضیلت میں دوزخ سے نجات کا ذریعہ قرار دیا، صحابہ کرامؓ نے بہت سے غلاموں کو آزاد کر کے جنت میں اپنے لئے جگہ بنالی، جیسے ابوبکر وعثمان غنی اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم وغیرہ۔

اسلام کی نظر میں ضعفاء کی بڑی لمبی فہرست ہے، سرفہرست بوڑھے لوگ، بیمار، معصوم بچے، قیدی، مظلوم، یتیم واسیر، فقیر ومسکین، بیوہ، بے کس وبے سہارا لوگ، لنگڑے، اندھے اور مجبور ومقہور لوگ وغیرہ بھی ضعیفوں کی فہرست میں داخل ہیں، ان سب کے ساتھ حسن سلوک کی اسلام تعلیم دیتا ہے، اور ان پر مہربانی کرنے کا حکم بھی دیتا ہے، بلکہ ان کے ساتھ ہمدردی کرنے کی صورت میں نصرت الٰہی اور رزق کا وعدہ کیا گیا ہے، ارشاد نبوی ﷺ ہے **فهـل تـنـصـرون وتـرزقـون الا بـضعفائكم (البخاری)** تمہاری مدد کی جاتی ہے اور تمہیں روزی دی جاتی ہے ان ضعیفوں کی بدولت۔

قرآن کریم میں معذور افراد کو زندگی کے عام معاملات اور میل جول میں نظر انداز کرنے کی روش کی سختی کے ساتھ مذمت کی' ہر انسان کو لائق عزت ووقار قرار دیا ہے' جیسا کہ حضرت عبداللہ ابن ام مکتومؓ نابینا صحابی جب آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ سرداران مکہ سے محو گفتگو ہونے

کی وجہ سے نابینا صحابی کی طرف متوجہ ہونہ سکے تو اس عدم توجہی پر سورہٴ عبس کی ابتدائی آیتیں نازل ہوئیں ۔ نبی کریم ﷺ اس واقعہ کے بعد حضرت ابن مکتوم کا بڑا خیال رکھتے تھے،ان کی بڑی عزت کرتے تھے، جب بھی نبی کریم ﷺ مدینہ سے باہر تشریف لے جاتے تو اس معذور صحابیؓ کو اپنا جانشین بنا کر جاتے ، وہ آپ کی غیر موجودگی میں قوم کی امامت فرماتے ، بینا صحابہ ایک نابینا صحابی کی اقتداء میں نمازیں ادا کرتے ، الغرض معذور افراد کی دل شکنی کسی بھی صورت میں نہ ہوتی تھی بلکہ ہمت افزائی کے کلمات سے نوازے جاتے ۔ جیسا کہ ارشاد نبوی ہے بیواؤں اور مسکینوں کی خبر گیری کرنے والا مجاہد فی سبیل اللہ کی طرح ہے، یا شب بیداری میں مصروف تہجد گزار یا دن میں روزہ رکھنے والے کے قائم مقام ہے،(بخاری)۔

معذور افراد کس طرح کی توجہ اور معاشرتی مقام کے حق دار ہیں حضرت عمر فاروق کے طرز عمل سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے ,ایک دفعہ حضرت عمرؓ لوگوں کو کھانا کھلا رہے تھے کہ ایک شخص کو دیکھا جو بائیں ہاتھ سے کھانا کھار ہا تھا۔آپ نے اس سے فرمایا کہ اِے بندہ خدا سیدھے ہاتھ سے کھا'اس نے کہا کہ وہ مشغول ہے' آپ آگے بڑھ گئے' دوبارہ جب گزر ہوا تو پھر وہی فرمایا اس نے وہی جواب دیا' پھر آپ تیسری بار گزرے تو اس کو اس پرٹوکا تو اس نے جواب دیا کہ موتہ کی لڑائی میں میرا دایاں ہاتھ کٹ گیا تھا' یہ سن کر آپ بہت روئے' پھر اس کے قریب بیٹھ کر پوچھا کہ تمہارا کپڑا کون دھوتا ہے' تمہاری دیگر ضروریات کس طرح پوری ہوتی ہیں ۔ تفصیلات معلوم ہونے پر آپ نے اس کے لئے ایک ملازم لگوادیا۔ اسے ایک سواری دلوائی' اور دیگر ضروریاتِ زندگی بھی دلوائیں،لوگوں نے کہاجزی الله عمر عن رعیته خیرا یعنی اللہ تعالی عمرؓ کو ان کی رعایا کی طرف سے بہتر بدلہ عنایت فرمائے۔(کتاب الآثار'ابو یوسف۔۲/۴۵۲)۔

اسی طرح کا واقعہ حضرت انس بن مالکؓ نے بیان کیا ہے کہ مدینہ منورہ کی لونڈیوں میں سے کوئی بھی لونڈی اللہ کے رسول ﷺ کے ہاتھ کو پکڑتی اور جہاں چاہتی نبی کریم ﷺ کو لے جاتی۔(صحیح بخاری'۶۰۷۲)۔

اسلام نے جہاں معذور افراد کو معاشرہ میں عدم توجہی سے محفوظ رکھنے کے احکامات جاری کئے،وہاں ان کی سوشل سیکورٹی کا بندوبست بھی کیا ہے ، قدرت نے انہیں کسی ایک صفت سے محروم کیا تو وہیں ان کی معاونت اور مدد کے لئے حقوق کی ادائیگی کا حکم بھی صادر کیا۔ جیسا کہ درج ذیل آیت سے معذور افراد کے ساتھ خصوصی عنایت اور توجہ برتنے اور ان کے ساتھ میل جول اور کھانے پینے کے سلسلہ میں واضح ہدایات کی طرف نشاندہی گئی ہے ، ان ضعیفوں کو فقر وفاقہ سے محفوظ رکھنے کی خاطر ، دردر کی ٹھوکریں کھانے سے محفوظ کردیا اوراعلان فرمادیا،لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّلَا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَاۗىِٕكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗٓ اَوْ صَدِيْقِكُمْ ۭ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا(سورة النور ، ۶۱) ترجمہ۔نہ تو اندھے پر کچھ گناہ ہے اور نہ لنگڑے پر اور نہ بیمار پر اور نہ خود تم پر کہ اپنے

گھروں سے کھانا کھاؤ یا اپنے باپوں کے گھروں سے یا اپنی ماؤں کے گھروں سے یا بھائیوں کے گھروں سے یا اپنی بہنوں کے گھروں سے یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے یا اس گھر سے جس کی کنجیاں تمہارے ہاتھ میں ہوں یا اپنے دوستوں کے گھروں سے (اور اس کا بھی) تم پر کچھ گناہ نہیں کہ سب مل کر کھانا کھاؤ یا جدا جدا۔

یعنی معاشرہ میں اس طرح کے معذور افراد کو حقیر سمجھ کر غیر مہذبانہ انداز میں الگ تھلگ بٹھا کر کھانا دینا معیوب ہے، اسی وجہ سے اکھٹے کھانے کی ترغیب دی گئی ہے، نیز رشتہ داروں کے بعد جن کی کنجیاں ان کے حوالہ کی گئیں وہاں سے بھی کھانے کی اجازت دی گئی۔ دوست واحباب کے گھر کو بھی رشتہ داروں کے گھروں سے تشبیہ دی گئی تا کہ یہ قربت بھی عظمت کی علامت رہے اور خصوصی افراد کے حقوق یہاں بھی محفوظ رہیں، جب کہ نزولِ قرآن کے وقت قریش اور سرداران مکہ معذور افراد کو منحوس اور قابل نفرت وملامت خیال کرتے تھے، مگر اللہ نے ان کی تکریم کرتے ہوئے ان کے حقوق اور عزت نفس کا اعلان کیا اور جاہلانہ رسموں کا قلع قمع کر دیا، اور ان کی ہمت افزائی کرتے ہوئے دائمی طور پر ان کے ساتھ حسن سلوک کو لازم وملزوم کر دیا، معاشرتی زندگی کے کسی بھی گوشہ میں انہیں تنہا نہ چھوڑا۔

کتاب وسنت کی روشنی میں معذوروں اور ضعیفوں کے ساتھ خصوصی توجہ دینا صالح معاشرہ کی ذمہ داری ہے' اسلام نے معاشرتی زندگی کے کسی گوشہ کو بھی تشنہ نہ چھوڑا، بلکہ ان کی کفالت عامہ کا انتظام وانصرام ہر دور میں تھا' خواہ وہ عہد نبوت ہو یا عہد خلافت راشدہ وغیرہ' جیسا کہ خلافت راشدہ میں مدینہ کے اطراف واکناف میں ایک نابینا بڑھیا تھی' حضرت عمرؓ روزانہ صبح سویرے اس کے لئے پانی اور دیگر ضروریات فراہم کر دیتے تھے' کچھ عرصہ بعد آپ کو محسوس ہوا کہ کوئی شخص ان سے پہلے آ کر یہ کام کر جاتا ہے' ایک روز تحقیق کی غرض سے رات کا کچھ وقت گزرنے کے بعد وہاں تشریف لے گئے' تو دیکھا کہ خلیفہ ابوبکر صدیقؓ اس ضعیفہ کی خدمت گزاری سے فارغ ہو کر اس کے جھونپڑے سے نکل رہے تھے۔ پھر آپ نے اپنی خلافت کے دور میں معذور وضعیف اور اپاہج حضرات کے حقوق کا سخت اہتمام کیا کہ کوئی شخص فقر وفاقہ میں مبتلا نہ ہو' حکم جاری کر دیا کہ ہر مفلوج اور اپاہج فرد کو بیت المال سے وظیفہ جاری کیا جائے۔ (کنزل العمال)۔

دین اسلام میں معذوروں اور ضعیفوں کے ساتھ خصوصی توجہ دی گئی' ان کی عزت واحترام میں کسی بھی طرح کی کمی نہیں کی گئی' بلکہ نبی کریم ﷺ نے یہاں تک فرمایا کہ کسی مسلمان کے لئے اتنی برائی ہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔ (مسلم، ۱۹۸٦' ۲۵۲۴) اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ **الراحمون یرحمهم الرحمن، ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء** (ابوداؤد، ترمذی) مہربانی کرنے والوں پر رحمٰن رحم فرماتا ہے، کرو تم مہربانی اہل زمین پر، آسمان والا تم پر مہربان ہوگا۔)

اسلامی تاریخ میں ان ضعیفوں نے وہ کارنامے انجام دئے جن کے تصور سے آج کے دور میں صحت مند انسان حیران ہے، مثال کے طور پر عبداللہ ابن ام مکتومؓ کا نبی کریم ﷺ کی غیر موجودگی میں آپ کی جانشینی کرنا وامامت کا فریضہ انجام دینا،

جنگ قادسیہ میں اسلام کی سربلندی کے لئے حاضر ہونا وغیرہ، نیز حضرت عمرو بن جموحؓ جو کہ ایک لنگڑے تھے، اپنے لنگڑے پیر کے ساتھ جہاد میں شریک ہوکر شہادت کا درجہ حاصل کیا، (اسدالغابہ) کم سن صحابہ کی ایک بڑی تعداد جنہوں اسلام کی بڑی خدمتیں انجام دی، انہی میں سے حضرت زید بن ثابتؓ بڑے مجتہد تھے، قرآن مجید کے حفاظ میں سے تھے، نبی کریم ﷺ کے بعد جمع قرآن کا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا، حضرت اسامہ بن زیدؓ نے کم سنی میں ہی فوج کی قیادت کرنے لگے، حضرت معاذ بن جبلؓ نے دعوت الی اللہ کی خاطر یمن کا رخ کیا، اہل یمن انہی کی کوششوں سے مشرف بہ اسلام ہوئے، مصعب بن عمیرؓ کی کوششوں سے مدینہ میں اسلام پھیلنا شروع ہوا، دور حاضر میں محمد رفعت جو نابینا تھے ان کی عظیم خدمات کی بدولت لوگوں کی بڑی تعداد مشرف بہ اسلام ہوئی، اسی طرح شیخ کشک رحمہ اللہ بھی معذور ہونے کے باوجود خدمات کی وجہ سے معروف ومقبول ہیں، طہٰ حسین نے (سابق وزیر تعلیم، مصر) جو کہ نابینا تھے، علم دوستی کی بدولت مصر میں جہالت کی تاریکیوں کو ختم کرکے ہر کس وناکس کے لئے علم کا دروازہ کھول دیا، الغرض اسلام میں ان ضعیفوں اور کمزوروں کی بڑی اہمیت ہے، اسلام ان کے جذبات واحساسات کی قدر کرتا ہے، ان کی ہمت افزائی بھی کرتا ہے، کسی کو معمولی سمجھنے کو گناہ تصور کرتا ہے۔

اہل ایمان کی دولت میں ان ضعیفوں اور معذوروں کا بھی حق مسلم ہے، یہ حق مال زکوۃ سے الگ ہے، ان معذوروں کی ضروریات کی تکمیل صالح اولا دو صالح معاشرہ بلکہ حکومتوں کی اہم ذمہ داری ہے، حالات کے اعتبار سے ان کی خاص خاص ضرورتوں میں سے مندرجہ ذیل چیزوں کا مہیا کرنا: مثال کے طور پر: کسی لنگڑے کیلئے بیساکھی کا انتظام، کسی کے لئے وہیل چیرز، مخصوص سائیکل، موٹر سائیکل، مصنوعی اعضاء کی پیوندکاری، ان معذوروں کی تعلیم وتربیت کا انتظام وانصرام ٹیکنیکل ٹریننگ سنٹرس، لائبریریوں کا قیام، چھوٹی چھوٹی دکانوں کے افتتاح سے معاشی استحکام، صنعت وحرفت کے ذریعہ ان ضعیفوں کی معیشت کا دروازہ کھولنا تا کہ وہ کسی پر بوجھ نہ بن سکیں، بھیک نہ مانگ سکیں، یہ تصور غلط ہے کہ ان کمزوروں کو صدقہ کا مال ہی ہمیشہ کھلایا جائے، بلکہ ان ضرور تمندوں کو خود کفیل بھی کیا جاسکتا ہے، انہیں معاشرہ میں خوددار بنایا جاسکتا ہے، غریبی کا خاتمہ ایسے بھی ممکن ہے کہ ان بے کسوں اور بے سہارا لوگوں کو سہارا دیا جائے، انہیں ان کی صلاحیتوں کے مطابق زندگی کی اس دوڑ میں شامل کیا جائے، اسلام نے صاف اعلان کیا کہ کوئی کسی کو ہرگز حقیر نہ جانے، ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ کسی مسلمان کے لئے اتنی برائی ہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے، (مسلم)۔

اللہ تعالی سے دعا ہے کہ ہمیں صحت وسلامتی کے ساتھ زندگی گزارنے کی توفیق بخشے، اور معاشرہ کے کمزور طبقہ کے ساتھ ہمدردی کرنے اور ان کے حقوق ادا کرنے کی توفیق عنایت فرمائے، آمین۔

☆☆☆

اسلامی تعلیمات

سود پر مبنی معیشت حرام کیوں؟

عتیق الرحمٰن
ریسرچ سکالر وحدانی نظام تعلیم فورم پاکستان

دنیا کے سبھی ممالک عمومی اور اسلامی ممالک خصوصی طور پر ایک طویل مدت سے قعر مذلت میں مبتلا نظر آتے ہیں۔جس کی متعدد شکلیں اور صورتیں متعارف ہوچکی ہیں۔کہیں سیاسی و معاشرتی بدامنی واستحصال کی لعنت ہے تو کہیں کرپشن ولوٹ کھسوٹ کی ریل پیل،کہیں ظلم وجور کا بازار گرم ہے تو کہیں عدل ومساوات کی کمیابی ،کہیں خودکشی وقتل وقتال اور قانون کو ہاتھوں میں لینے کی عادت تو کہیں دووقت پیٹ کی بھرتی کے لئے اپنی دوشیزاؤں کی فروخت بازاری،کہیں سیاست تو کہیں مذہب کے ٹھیکہ داروں نے انسانیت کی فکری ونظری آزادی کو سلب کررکھا ہے تو کہیں فوجی و جمہوری طاقتوں نے جبر واستبداد کا شکنجہ عوام پر کس لیا،کہیں دہشت گردی کے خونچکاں واقعات ہیں تو کہیں انسانوں کو تاابد غلام رکھنے کے لئے سیاسی وقومی،لسانی ومذہبی گروہوں میں بندر بانٹ دیا گیا۔یہ سب تباہی وبربادی اور تقھقرو ھبوط صرف اس لئے ہے کہ ہم باوجود اپنے آپ کو اسلام جیسے آفاقی وعالمی تاامروز رہنے والے دین سے تعلق کا راگ الاپتے نہیں تھکتے مگر ہم اسی دین حق کی اساسی و بنیادی تعلیمات سے انحراف برتتے ہیں۔انہیں امراض وبیماریوں کے ظہور ووجود میں آنے کا سبب خود باری تعالیٰ نے یوں ذکر کردیا کہ جو لوگ میرے ذکر(قرآن) سے منحرف ہوں گے تو میں ان کی معیشت کو تنگ کردوں گا۔ایسا کیوں نہ ہو کہ معاشرے نے اس قبیح فعل کو ببانگ دہل اور کھلی اعلانیہ بغاوت کے طور پر سود(ربا) کو اپنے اوپر حلال کرلیا جبکہ اسی سے متعلق اللہ جل شانہ نے ارشاد فرمایا کہ سود خور اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کے لئے کمربستہ ہوجائیں۔

سود کیا ہے؟ سود وزن کی جانے والی یا کسی بھی پیمانہ سے ناپی جانے والے ایک جنس کی چیزیں اور روپے وغیرہ میں دو آدمیوں کا اس طرح معاملہ کرنا کہ ایک کو عوض کچھ زائد لوٹایا جائے، اسی کو انگریزی میں Interest کہتے ہیں۔اسی طرح بینک سے قرض لینے یا اس میں جمع شدہ مال پر پہلے سے طے شدہ منافع حاصل کرنا بھی سود ہے۔سودی معیشت ایک ایسا مذموم عمل ہے جو پوری دنیا میں بڑی تیزی کے ساتھ فروغ پاتا جارہا ہے۔سودی لین دین کی دلدل میں انسانیت کے سبھی طبقات دھنسے ہوئے ہیں۔اس سود کی نحوست ومضمرات سے تغافل کے نتیجہ میں معاشرے کے انفرادی واجتماعی ادارے ذلت وپستی اور تنگی و بے سکونی سے دوچار ہیں۔معیشت کی گراوٹ و ناکامی کا سبب بھی سودی معاملات کا جاری رکھنا ہے کیوں کہ رب رحمٰن نے سود خوروں سے اپنی اور اپنے نبیؐ کی طرف سے جنگ کا اعلان جو کردیا ہے۔ربا ایک ایسا لاعلاج مرض ہے جو مال ورزق میں تنگی کا باعث بنتا ہے اور اسی کے ساتھ مال ودولت سے برکت بھی جاتی رہتی ہے۔تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات میں سود ونفع خوری کی سخت حرمت کے احکام موجود ہیں۔بدقسمتی کی بات ہے کہ موجودہ اسلامی ممالک کی معیشت وکاروبار کی بنیاد بھی اسی سودی نظام پر قائم ہے۔اسی لئے لازمی ہے کہ اس اہم موضوع پر بات کی جائے اور اس کے نقصانات ومسائل سے ہر مسلمان و انسان کو باخبر ہونا چاہیے تاکہ وہ لین دین کے معاملہ میں سود کے

اثرات وشروراورضرر سے محفوظ رہ سکیں۔

سودی لین دین پر میثاق مدینہ کا ٹوٹنا:

نبی اکرمؐ نے مکہ سے ہجرت مدینہ کی طرف کی اور وہاں پہنچ کر جن اہم اقدامات کا فیصلہ کیا ان میں مسلمانوں کی حیثیت کو تسلیم کراتے ہوئے قبائل سے میثاق ومعاہدہ کیا جو میثاق مدینہ کے نام سے مشہور ہے ۔اس معاہدہ میں جس قدر شدید موقف سودی لین دین کے خاتمے سے متعلق مستقر ٹھہرایا گیا اس کی مثال نہیں ملتی چونکہ سود کی حرمت کا حکم سابقہ ادیان میں دیے جانے کے ساتھ اسلام میں بھی اس کو حرام قرار دیا گیا۔ میثاق مدینہ کے تمام مندرجات میں لچک و رواداری کی گنجائش رکھی گئی کہ اگر ایک فرد معاہدہ کے بعد قتل یا چوری یا کوئی اور ظلم و زیادتی و دست درازی کا مرتکب ہوگا تو اس کی سزا صرف اس کو ہی دی جائے گی اور باقی قبیلہ کے افراد مامون ومحفوظ ہوں گے۔سودی کاروبار یا تجارت کے متعلق سختی اور پوری قوت کے ساتھ بات طے کردی گئی کہ اگر کوئی بھی ربا (سود) کو اختیار کرے گا تو معاہدہ بلاتاخیر ختم کردیا جائے گا۔

سودقرآن مجید کی روشنی میں:

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اور نبی اکرمؐ نے احادیث طیبہ میں سود کی حرمت کو مفصل انداز میں بیان کیا ہے۔سورہ البقرہ کی آیت نمبر 279-275 میں بیان کیا ہے کہ ’’جولوگ سود کھاتے ہیں وہ قبروں سے اس طرح حواس باختہ اٹھیں گے جیسے کسی کو جن نے لپٹ کر دیوانہ بنادیا ہو۔ یہ اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ سودا بیچنا بھی تو نفع کے لحاظ سے ویسا ہی ہے جیسے سود لینا،حالانکہ سودے کو اللہ نے حلال کیا ہے اور سود کو حرام،تو جس شخص کے پاس اللہ کی نصیحت پہنچی اور وہ سود لینے سے باز آ گیا تو جو پہلے ہو چکا وہ اس کا۔اور قیامت میں اس کا معاملہ اللہ کے سپرد اور جو پھر لینے لگا تو ایسے لوگ دوزخی ہیں کہ ہمیشہ دوزخ میں جلتے رہیں گے۔اللہ سود کو نابود یعنی بے برکت کرتا اور خیرات کی برکت کو بڑھاتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے گناہگار کو دوست نہیں رکھتا۔جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے رہے ان کو ان کے کاموں کا صلہ اللہ کے ہاں ملے گا اور قیامت کے دن ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غم ناک ہوں گے۔مومنو! اللہ سے ڈرو اور اگر ایمان رکھتے ہو تو جتنا سود باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو۔پھر اگر ایسا نہ کرو گے تو تم اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے اعلان جنگ سن لو اور اگر توبہ کرلو گے اور سود چھوڑ دو گے تو تم کو اصل رقم لینے کا حق ہے جس میں نہ اوروں کا نقصان اور نہ تمہارا نقصان‘‘۔اور اسی طرح سورہ الروم کی آیت نمبر 39 میں بھی بیان کیا گیا ہے کہ ’’اور جو سود تم دیتے ہو لوگوں کے مال میں بڑھے تو اللہ کے نزدیک تو وہ بڑھتا بھی نہیں اور جو تم زکوٰۃ دیتے ہو اللہ کی رضا مندی طلب کرتے ہوئے تو وہ موجب برکت ہے اور ایسے ہی لوگ اپنے مال کو کئی گنا کرنے والے ہیں‘‘۔اور سورہ آل عمران کی آیت (131-130) میں بھی بیان ہے کہ ’’اے ایمان والو! دوگنا سود مت کھاؤ،اور اللہ سے ڈرو تا کہ تم کو کامیابی حاصل ہو اور ڈرو اس آگ سے جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے‘‘۔

سود سنت نبوی کی روشنی میں:

صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ’’نبی کریمؐ نے لعنت بھیجی ہے سود کھانے والے،سود کے لین دین میں گواہ بننے والے،سود کے معاملہ کو لکھنے والے اور سودی کاروابار کے مشاہدہ کرنے والے پر اور یہ سب لعنت کے مستحق ہیں۔صحیح بخاری میں حضرت سمرۃ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ نبی کریمؐ نے فرمایا کہ ’’رات میں نے خواب میں دیکھا دو آدمی میرے پاس آئے اور مجھے ایک مقدس جگہ کی طرف لے گئے حتیٰ کہ ہم ایک خون کی نہر کے پاس پہنچے جس میں ایک آدمی کھڑا تھا اور ایک آدمی نہر کے کنارے موجود تھا اور اس کے سامنے پتھر موجود تھے،جو شخص نہر میں موجود تھا وہ نہر سے نکلنے کی خاطر چلتا ہوا نہر کے کنارے کی طرف آتا تھا تو باہر موجود شخص اس کے چہرے پر پتھر برساتا تھا جس کے سبب وہ آدمی دوبارہ خون کی نہر میں چلا جاتا،اسی طرح جب بھی وہ باہر نکلنے کی سعی کرتا تو باہر موجود شخص اس پر پتھر برساتا جس سے نہر میں سے وہ آدمی نہیں نکل سکتا تھا۔تو میں نے دریافت کیا کہ یہ کون ہیں؟ تو مجھے بتایا گیا کہ نہر میں موجود شخص (جس پر سنگ باری کی جارہی ہے)وہ سود خور ہے‘‘۔بخاری ومسلم دونوں میں وارد ہے کہ نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا کہ

سات قسم کے گناہوں سے بچو جو انسانوں کو ہلاک کرنے والے ہیں۔صحابہ نے استفسار کیا کہ وہ کون سے گناہ ہیں تو آپؐ نے فرمایا کہ" (۱)شرک کرنا(۲) جادو کرنا(۳) کسی شخص کو ناحق قتل کرنا(۴) سود کھانا(۵) کسی کا مال ہڑپنا(۶) میدان جنگ سے فرار ہونا(۷) پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانا"۔طبرانی میں روایت ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ سود کے ۷۰ درجے ہیں جس میں ادنی درجہ یہ ہے کہ انسان اپنی ماں کے ساتھ زنا کرے"۔امام احمد فرماتے ہیں کہ محبوبؐ نے فرمایا ہے کہ"ایک درہم سود کھانے کا گناہ چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے زیادہ ہے"۔

سود کی حرمت کا سبب: سود اس لئے حرام کیا گیا ہے کیوں کہ اس میں استحصال اور ظلم کا عنصر پایا جاتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے ہر طرح کے ظلم کو حرام قرار دیا ہے اپنے بندوں پر۔اس کی حرمت کا سبب یہ بھی ہے کہ سودی لین دین کی خواہش رکھنے والے غبن (قبضہ و ارتکاز) کرتے ہیں لوگوں کے مال کو اور اس کے ساتھ وہ اپنے مال کی حفاظت کے ارادہ سے سود کا کاروبار کرتے ہیں۔بہر حال سود ایک ایسا غلیظ جرم ہے جو اللہ تعالیٰ کے مرتب کردہ سنن و منہج سے ٹکراتا ہے یعنی یہ فطرت انسانی کے ہی خلاف ہے کہ ایک انسان دوسروں کی کمائی بغیر محنت کے نفع حاصل کر کے گل چھڑے اڑائے۔

سود کے نقصانات ملکی معاملات میں:

سود ملکوں کے درمیان معاملات کا سب سے بڑا ذریعہ بن چکا ہے اور یہ سیاسی غلبہ حاصل کرنے کا بھی بنیادی ہتھیار ہے۔جو شخص بحث و تحیص اور تحقیق کا عادی ہے وہ یہ بآسانی جان سکتا ہے کہ یہودی استعماری طاقتوں نے زمانہ قدیم اور جدید یعنی عصر حاضر میں کس طرح دولت کی گردش کو جامد کر کے اس کا تمام فائدہ اپنی طرف کھینچ لیا ہے۔اسی ذریعہ سے ماضی میں برطانیہ اور فرانس نے شرق اوسط اور شرق اقصیٰ میں غلبہ حاصل کیا۔اس کے ساتھ استعماری قوتیں اسلامی ممالک میں تاجروں کے ذریعہ سے سود و نفع حاصل کرتی ہیں کہ مشرقی ممالک سے سستے داموں اشیاء خرید کر ان کو واپس انہی کو مہنگے دام میں فروخت کرتی ہیں۔اسی طرح تیسرے طریقے میں بڑے منافع خوروں نے ایک سبیل یہ پیدا کی کہ بنکنگ کے نظام کو متعارف کروایا اور اس طرح سے غریب و کمزور ممالک کو بہت زیادہ سود پر قرضے جاری کرتے ہیں اور یہ ایک ایسا ظالمانہ طریقہ ہے استعمار کا کہ وہ سرمایہ داروں کے مال و متاع کا بذریعہ سود تحفظ کرتے ہیں۔

دعوت فکر: مندرجہ بالا بحث سے معلوم ہوا کہ سودی لین دین بہت بڑا ظالمانہ نظام ہے اور یہ ایک عذاب الیم ہے جو کہ مسلمانوں پر مسلط ہو چکا ہے استعمار و سرمایہ دار کی جانب سے کیوں کہ مسلمانوں نے اسلامی تعلیمات سے دوری و پہلو تہی اختیار کی ہوئی ہے،تو ایسی صورتحال میں ممکن نہیں کہ اسلامی ممالک کے حالات بہتر ہوں یا وہ ترقی کی منازل طے کر سکیں، الا یہ کے وہ اسلامی احکامات پر اور رجوع الی اللہ کریں،اور اپنے مال و منال کو سود سے پاک کریں، یہ ذمہ داری تمام مسلمانوں پر انفرادی و اجتماعی دونوں اعتبار سے عائد ہوتی ہے۔یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ جس بھی سماج کو اللہ ہلاک و برباد کرنے کا ارادہ کر لیتے ہیں تو اس میں سود کو ظاہر کر دیتے ہیں۔اور جس بھی قوم نے ایک بار سود کو اپنا لیا وہ ہمیشہ کے لئے اس میں دھنس جاتے ہیں اور چاہ کر بھی اس سے چھٹکارا نہیں پا سکتے،یہی صورت حال ہمارے اسلامی ممالک کی ہے۔ہم حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ فی الفور سودی کاروبار سے قطع تعلقی کا فیصلہ و اعلان کرے کیوں کہ جو مالی و اخلاقی اور اجتماعی و سماجی مسائل انہیں درپیش ہیں ان کے پس پردہ یہی سودی نظام معیشت کو اختیار کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ سود کو اختیار کرنے والوں پر ذلت و پستی اور عذاب مسلط کر دیتے ہیں۔قرآن حکیم میں ارشاد ربانی ہے کہ"جو ہماری نصیحت (ذکر و قرآن) سے اعراض کرے گا ہم اس پر معاشی تنگی مسلط کر دیں گے"۔تمام انسانوں پر فرض ہے کہ وہ سودی معاملات خواہ چھوٹی سطح پر ہوں یا بڑی سطح سے فی الفور تائب ہو کر کنارہ کشی اختیار کریں۔معاشرے کی معاشی پریشانیوں سے نجات کے لئے قرض حسنہ،العفو،زکوٰۃ و صدقات کی ادائگی کو لازم پکڑیں اور کفایت شعاری وقناعت پسندی کو شعار بنالیں اور اسراف و تبذیر اور تقتیر سے مجتنب ہوں۔

☆☆☆

خصائص وامتیازات (قسط-٦)

امت محمدیہ، خصوصیات وامتیازات

محمد قمرالزماں ندوی
جنرل سکریٹری: مولانا علاء الدین ایجوکیشنل سوسائٹی، جھارکھنڈ
maeducationalsociety@gmail.com

چھٹی خصوصیت: ایمان والوں کے لئے میدان حشر میں خاص نور: روز قیامت محشر میں اللہ عزوجل مومنوں کو ایک نور (روشنی) دے گا جو ایمان والوں کے آگے آگے چلتا ہوگا۔ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کو اس کی بشارت دی ہے۔ اور یہ شرافت وفضیلت دوسری امتوں کو حاصل نہیں ہوگی۔

ارشادخداوندی ہے: یوم لا یخزی الله النبی واللذین آمنوا معه نورهم یسعی بین ایدیهم وبایمانهم یقولون ربنا اتمم لنا نورنا...... (سورہ تحریم، آیت نمبر ۸) ”یہ وہ دن ہوگا جب اللہ تعالیٰ اپنے نبی اوران لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں رسوانہ کرے گا۔ ان کا نوران کے آگے آگے اوران کے دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا اور وہ کہہ رہے ہوں گے کہ ہمارے رب! ہمارا نور ہمارے لئے مکمل کر دے اور ہم سے درگزر فرما، تو ہر چیز پر قادر ہے)“

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ مومن میں یہ نوران کے اعمال کے بقدر تقسیم ہوگا۔ کسی کا نور مثل پہاڑ کے، کسی کا کھجور کے درخت کے مثل، اور کسی کا نورانسانی قد وقامت کے برابر ہوگا۔ سب سے کم نوراس شخص ہوگا، جس کے صرف انگوٹھے میں نور ہوگا اور وہ بھی کبھی روشن ہو جائے گا کبھی بجھ جائے گا۔

اس آیت کو سورۂ حدید کی آیات ۱۲-۱۳ کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اہل ایمان کے آگے آگے دوڑنے کی یہ کیفیت اس وقت پیش آئے گی، جب وہ میدان حشر سے جنت کی طرف جا رہے ہوں گے، وہاں ہر طرف گھپ اندھیرا ہوگا جس میں وہ سب لوگ ٹھوکریں کھا رہے ہوں گے، جن کے حق میں دوزخ کا فیصلہ ہوگا اور روشنی صرف اہل ایمان کے ساتھ ہوگی جس کے سہارے وہ اپنا راستہ طے کر رہے ہوں گے۔ اس نازک موقع پر تاریکیوں میں بھٹکنے والے لوگوں کی آہ وفغاں سن سن کر اہل ایمان پر خشیت کی کیفیت طاری ہو رہی ہوگی، اپنے قصوروں اور اپنی کوتاہیوں کا احساس کر کے انہیں اندیشہ لاحق ہوگا کہ کہیں ہمارا نور بھی نہ چھن جائے، اور ہم ان بدبختوں کی طرح ٹھوکریں کھاتے نہ رہ جائیں، اسی لئے وہ دعا کریں گے کہ اے ہمارے رب ہمارے قصور معاف فرما دے اور ہمارے نور کو جنت میں پہنچنے تک ہمارے لئے باقی رکھ، ابن جریر نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ "ربنا اتمم لنا نورنا" کے معنی یہ ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں گے کہ ان کا نور اس وقت تک باقی رکھا جائے اور اسے نہ بجھنے دیا جائے جب تک وہ پل صراط سے بخیریت نہ گزر جائیں“۔

حضرت حسن بصری اور مجاہد اور ضحاک کی تفسیر بھی قریب قریب یہی ہے۔ ابن کثیرؒ نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ”اہل یمان جب دیکھیں گے کہ منافقین نور سے محروم رہ گئے ہیں تو وہ

اپنے حق میں اللہ سے تکمیل نور کی دعا کریں گے۔(بحوالہ تفہیم القرآن جلد ششم تفسیر سورۂ تحریم)۔

ساتویں خصوصیت : اس امت کی بڑی تعداد کا حساب کے بغیر جنت میں داخلہ

حضرت ابوامامہؓ حدیث کے راوی ہیں وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضورؐ سے سنا، آپؐ فرماتے تھے کہ میرے پروردگار نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ میری امت میں سے ستر ہزار کو وہ بغیر حساب اور بغیر عذاب کے جنت میں بھیجے گا، اوران میں سے ہر ہزار کے ستر ہزار ہی اور ہوں گے۔اور تین حثی اور میرے پروردگار کے حثیات میں سے (میری امت میں سے بغیر حساب اور بغیر عذاب کے جنت میں بھیجے جائیں گے)۔

(جب دونوں ہاتھ بھر کر کسی کو کوئی چیز دی جائے تو عربی میں اس کو حثیہ کہتے ہیں جس کو اردو اور ہندی میں لپ بھر کہتے ہیں)

عن ابی امامة قال سمعت رسول الله ﷺ يقول وعدني ربی أن يدخل الجنة من امتی سبعين الفا لا حساب عليهم ولا عذاب مع كل وعدنی ربی أن يدخل الجنة من امتی سبعين الفا لا حساب عليهم ولا عذاب مع كل ألف سبعون الفا وثلث حشيات من حشيات ربی (رواه احمد والترمذی)۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی امت میں سے ستر ہزار کو بلا حساب اور بلا عذاب جنت میں داخل کرے گا، اور پھر ان میں سے ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار ہی اوراسی طرح بلا حساب وعذاب جنت میں جائیں گے۔اوراس سب کے علاوہ اللہ تعالیٰ اپنی خاص شانِ رحمت سے اس امت کی بہت بڑی تعداد کو تین دفعہ کرکے اور جنت میں بھیجے گا اور یہ سب وہی ہوں گے جو بغیر حساب اور بغیر عذاب کے جنت میں داخل ہوں گے۔سبحانك وبحمدك يا ارحم الراحمين

اس قسم کی حدیثوں کی پوری حقیقت اس وقت کھلے گی، جب یہ سب باتیں عملی طور پر سامنے آئیں گی، اس دنیا میں تو ہمارا علم وادراک اتنا ناقص ہے کہ بہت سے ان واقعات کو صحیح طور پر سمجھنے سے بھی ہم قاصر رہتے ہیں، جن کی خبریں ہم اخباروں میں پڑھتے ہیں، مگراس قسم کے واقعات کا بھی ہم نے تجربہ اور مشاہدہ کیا ہوا نہیں ہوتا۔ صدق الله ربنا عز وجل "وما اوتيتم من العلم إلا قليلا" (معارف الحديث جلد اول صحه ١٤٦–١٤٥)

مفسرین نے سورہ فاطر آیت نمبر۳۲ "فمنهم ظالم لنفسه ومنهم مقتصد ومنهم سابق بالخيرات" کی تفسیر میں لکھا ہے کہ باری تعالیٰ قیامت کے دن امت محمدیہ کی ایک بڑی تعداد (جماعت) کو بغیر حساب وکتاب کے جنت میں داخل کرے گا۔ یہاں تک کہ اس امت کے گنہگار بندوں کو بھی معاف کردیا جائے گا۔ مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ اس آیت کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں: ''پھران منتخب اور پسندیدہ لوگوں کی تین قسمیں ہیں کہ بعضے توان میں کوئی گناہ کرکے اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعضے ان میں جو نہ گناہ کرتے ہیں اور نہ طاعات میں ضروریات سے تجاوز کرتے ہیں، متوسط درجے کے ہیں۔اور بعض ان میں وہ ہیں جو خدا کی توفیق سے نیکیوں میں ترقی کئے چلے جاتے ہیں۔(معارف القرآن جلد ۷ تفسیر سورۂ فاطر)۔

ان تینوں قسموں کی تفسیر امام ابن کثیرؒ نے اس طرح بیان فرمائی ہے کہ ''ظالم'' سے مراد وہ آدمی ہے جو بعض واجبات میں کوتاہی کرتا ہے۔اور بعض محرمات کا بھی ارتکاب کر لیتا ہے۔

اور ''مقتصد'' یعنی درمیانی چال چلنے والا وہ شخص ہے جو تمام واجبات شرعیہ کو ادا کرتا ہے اور تمام محرمات سے بچتا ہے۔مگر بعض اوقات بعض مستحبات کو چھوڑ دیتا ہے اور بعض مکروہات میں مبتلا بھی ہوجاتا ہے۔اور ''سابق بالخیرات'' وہ شخص ہے جو تمام واجبات اور مستحبات کو ادا کرتا ہے اور تمام محرمات و مکروہات سے بچتا ہے اور بعض مباحات کو اشتغال عبادت یا شبہ حرمت کی وجہ سے چھوڑ دیتا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ''سابق بالخیرات'' بغیر حساب وکتاب جنت میں داخل ہوں گے ''مقتصد'' اللہ کی رحمت سے

جنت میں داخل ہوں گے اور ''ظالم لنفسہ'' شفیع المومنین ﷺ کی سفارش سے جنت میں داخل ہوں گے۔

مسند احمد میں حضرت ابو درداء سے مروی ہے کہ میں نے حضور ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو سابق بالخیرات'' ہیں وہ تو بلا حساب و کتاب جنت میں جائیں گے۔ اور جو ''مقتصد'' ہیں ان سے ہلکا حساب لیا جائے گا۔

اور جو ''ظالم'' ہیں ان کو اس مقام میں سخت رنج وغم طاری ہوگا۔ پھر ان کو بھی جنت میں داخلہ کا حکم ہوجائے گا اور سب رنج وغم دور ہوجائے گا۔ (معارف القرآن جلد ۷ صفحہ ۳۴۵)

ایک موقع پر آپؐ نے اس آیت کی تلاوت کر کے فرمایا۔ سابقین تو بے حساب جنت میں جائیں گے اور درمیانے لوگوں سے آسانی کے ساتھ حساب لیا جائے گا اور اپنے نفسوں پر ظلم کرنے والے طولِ محشر میں روکے جائیں گے۔ پھر خدا کی رحمت سے تلافی ہوجائے گی اور یہ کہیں گے خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہم سے غم و رنج دور کردیا۔ ہمارا رب بڑا ہی غفور وشکور ہے جس نے ہمیں اپنے فضل وکرم سے رہائش کی ایسی جگہ عطا فرمائی، جہاں ہمیں کوئی دردو دکھ نہیں (مسند امام احمد)۔

ابن جریرؒ نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے کہ حضرت ابو ثابت مسجد میں آتے ہیں اور حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھ جاتے ہیں۔ اور دعا کرتے ہیں کہ خدایا میری وحشت کا انیس (غمخوار وغمگسار) میرے لئے مہیا کردے اور میری غربت (اجنبیت) پر رحم کر اور مجھے کوئی اچھا رفیق عطا فرما۔ یہ سن کر صحابی (ابو درداءؓ) ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ میں تیرا ساتھی ہوں۔ سن میں تجھے آج وہ حدیث رسولؐ سناتا ہوں جسے میں نے آج تک کسی کو نہیں سنایا، پھر اس آیت کی تلاوت کی اور فرمایا: سابق بالخیرات تو جنت میں بے حساب جائیں گے اور مقتصد لوگوں سے آسانی کے ساتھ حساب لیا جائے گا اور ظالم لنفسہ کو اس مکان میں غم و رنج پہنچے گا جس سے نجات پا کر کہیں گے خدا کا شکر ہے، جس نے ہم سے غم و رنج دور کردیا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ میری امت کے تین حصے ہیں، ایک بے حساب و بے عذاب جنت میں جانے والا، دوسرا آسانی سے حساب لیا جانے والا اور پھر بہشت نشین ہونے والا، تیسری وہ جماعت ہوگی جن سے باز پرس تو ضرور ہوگی لیکن پھر فرشتے حاضر ہوکر کہیں گے کہ ہم نے انہیں ''لا الہ الا اللہ وحدہ'' کہتے ہو پایا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، سچ ہے میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ اچھا میں نے ان سے اس قول کی وجہ سے چھوڑا جاؤ انہیں جنت میں لے جاؤ اور ان کی خطائیں جہنمیوں پر لادو۔ اسی کا ذکر آیت **ولیحملن اثقالھم واثقالاً مع اثقالھم** میں ہے۔ یعنی وہ (جہنمی) ان کے بوجھ اپنے بوجھ کے ساتھ اٹھائیں گے۔ (تفسیر ابن کثیر تفسیر سورۂ فاطر)۔

حضرت ابو بکرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری امت کے ۷۰ ہزار لوگ بغیر حساب و کتاب کے جنت میں داخل ہوں گے، ان کے چہرے چاندنی رات کی طرح چمکتے ہوئے ہوں گے۔ ایک موقع پر حضور ﷺ نے فرمایا: جنت میں داخل ہونے والے پہلے گروہ کا چہرہ ''بدر کامل'' کی طرح چمکتا ہوا ہوگا اور جنت میں ان کے بعد داخل ہونے والوں کے چہرے ستاروں کی طرح روشن ہوں گے۔ (مسلم باب اول زمرۃ یدخل الجنۃ علی صورۃ القمر الخ) ایک روایت میں مزید تفصیل ذکر کی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میرے رب نے مجھ سے وعدہ کیا کہ میری امت کے ستر ہزار لوگ بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے اور ہر ایک ہزار جنتی ستر ہزار جنتیوں کے لئے سفارش کرے گا۔ پھر میرا رب اپنی ہتھیلیوں سے تین ہتھیلی لوگوں کو جنت میں داخل کرے گا۔ اور آپؐ نے مزید فرمایا کہ ستر ہزار پہلے اپنے آباء واجداد، اولاد اور اہل خاندان کے لئے سفارش کریں گے۔ (ابن کثیر تفسیر سورۂ فاطر)۔

(......**جاری**) ☆☆☆

فکر اسلامی　(قسط-٦)

مفکر اسلام- ایک مطالعہ

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

اسلامی بیداری کی لہر

موجودہ عرب دنیا کا جمود و تعطل کسی پر مخفی نہیں، دین کی افہام و تفہیم کا بھی وہ پیمانہ نہ رہا جو مطلوب تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ بعض دکھاوے کے کاموں کو کر لینے سے یہ سمجھا جانے لگا کہ یہی دین اور دینی خدمت ہے، تحریکات بھی جو دینی خدمت کا دم بھرتی ہیں وہ دین کی خدمت کم اور اپنے نظریات کی ترسیل وترویج زیادہ کرتی ہیں جس کے نتیجہ میں احیاء اسلام کی جو کوششیں ہونی چاہیے وہ نہیں ہو پاتیں، متحدہ عرب امارات کے سفر میں المجمع الثقافی میں مولانا نے "اسلامی بیداری کی لہر" کے موضوع پر جو محاضرہ دیا وہ ایمان افروز وچشم کشا ہے، اس کی تلخیص مولانا نے کاروان زندگی میں پیش کی ہے، اس کا ہر ہر جملہ بہت طاقتور اور زمانہ کے حالات پر صریح نقد ہے اس لئے اسے من وعن نقل کیا جارہا ہے:

"تاریخ کا ایک سبق جو بار بار دہرایا جاتا رہا ہے، اور جس سے عبرت حاصل کرنا ضروری ہے، یہ ہے کہ بہت سی بنیادی، اصلاحی تحریکیں جو درحقیقت اس مقصد سے اٹھیں کہ عقل و فکر اور زندگی پر طاری جمود کو توڑیں، اسلام کے بہتے ہوئے دریا کی سطح پر جم جانے والی کائی کو دور کریں، اور معاشرہ میں رائج ان رسموں، عادتوں، اور رواجوں کی زنجیروں کو توڑ دیں، جن کی نہ کوئی دینی حقیقت ہے، اور نہ معقولیت، جو تحریکیں اس لئے وجود میں آئی تھیں کہ اسلامی معاشرہ کی جامد عقلوں کو جھنجھوڑ دیں، انکی خفیہ صلاحیتوں کو بیدار کردیں، تاکہ نئی نسل اپنے زمانہ کو اور زمانہ کی مشکلات کو سمجھ سکے، زمانہ کے صحیح اور مقبول تقاضوں کی تکمیل کر سکے، زمانہ کا ساتھ دے سکے اور صرف ساتھ ہی نہیں، بلکہ اپنے زمانہ کی قیادت ورہنمائی کر سکے، اور اس بات کا علمی ثبوت پیش کر سکے کہ اسلام ہر زمانہ کے سوالات کا جواب فراہم کر سکتا ہے، مشکلات کو حل کر سکتا ہے، وہ ہر چیلنج کا مقابلہ کرنے کی اور ہر دور میں قیادت کی صلاحیت رکھتا ہے، تاریخ کا یہ بڑا عبرتناک سبق ہے کہ ایسی اصلاحی تحریکیں -اگر ان کو انقلابی نہ کہا جائے- مرور زمانہ کے ساتھ خود اسی جمود کا شکار ہوگئیں جس سے نبرد آزمائی کے لئے وجود میں آئی تھیں، اور خود اپنے ابتدائی طریقہ کار اور لائحہ عمل کی زنجیروں میں گرفتار نظر آنے لگیں، جو طریق کار ان تحریکات کی ابتداء میں اس وقت کے تقاضوں کے مطابق وضع کیا گیا تھا، اور جو ایک محدود دائرہ کے اندر اصلاحی تحریک کے تقاضوں کو پورا کرتا تھا، ان تحریکوں اور ان سے متعلق افراد نے ان لکیروں کو مضبوطی سے تھام رکھا ہے جو لکیریں ان تحریکوں کے سربراہوں نے ماضی میں بڑے اخلاص اور بڑے فہم وتدبر کے ساتھ زمانہ کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے بنائی تھیں:-

یحمل هذا العلم من كل خلف عدوله ينفون عنه تحريف الغالين وانتحال المبطلين وتاويل الجاهلين (مشکوٰۃ کتاب العلم حدیث ۲۴۸) اس علم کے ہر نسل میں ایسے عادل ومتقی حامل ووارث ہوں گے، جو اس دین سے غلو پسند لوگوں کی تحریف، اہل باطل کے غلط انتساب ودعوے اور جاہلوں کی دوراز کار تاویلات کو دور کرتے رہیں گے۔

لیکن ان جماعتوں اور تحریکوں نے ان لکیروں کو اس مضبوطی سے تھام رکھا ہے، جیسے کوئی کسی نص قطعی اور منصوص حکم پر جما رہے، جس

میں نہ کسی حذف واضافہ کی گنجائش ہو، نہ کسی طرح کی لچک یا توسع کا امکان، جس کی وجہ سے ان دعوتوں اور تحریکات میں کام کرنے والوں کے ذہنوں پر جمود کا سایہ ہو گیا ہے، اوران میں کبھی کبھی انتہا پسندی بھی آجاتی ہے، کہ وہ اپنے طریق کار سے سرمو تجاوز گوارا نہیں کرتے، اور اس پر اس طرح اصرار کرتے نظر آتے ہیں، جیسے وہ بھی کوئی شریعت کی نص قطعی ہو، یا منزل من اللہ قرآن کی آیت۔

اس کا سبب اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ یہ تحریک قوت نمو کھو چکی ہے، اس میں اتنی قدرت وصلاحیت باقی نہیں کہ ماحول کا ازسرنو جائزہ لے، روح عصر کو پہچانے، نئے تقاضوں کو سمجھے، زمانہ کی نبض پر انگلیاں رکھے، اس کے مرض کی صحیح تشخیص کرے، اور اصلاح وعوت کے طریق کار اور زندگی کے حقائق اور تقاضوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرے۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کبھی بھی زمانہ سے پیچھے نہیں رہا، اس نے ہمیشہ انسانی معاشرہ کی قیادت کی ہے، اور اپنی تعلیمات اور زمانہ کے تقاضوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی صلا حیت کا ثبوت دیا ہے، ایسے علماء اور قائدین ہر دور میں موجود رہے ہیں، جن میں فکری بالیدگی تھی، بے مثال ذہانت تھی، وہ دینی اصولوں اور شریعت کے اولین مصادر سے احکام کے استنباط اور اجتہاد کی قدرت وصلاحیت رکھتے تھے، انھوں نے حیرت انگیز صلاحیت اور بے مثال عبقریت (GENIUS) کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہر زمانہ اور ہر مقام کے چیلنجوں کا مقابلہ کیا، زمانہ کے مطالبات اور امت مسلمہ کی ضرورتوں کی تکمیل کی، انھوں نے زندگی کے حقائق سے کبھی آنکھیں بند نہیں کیں، وقت کی طلب اور زمانہ کی آواز پر ہمیشہ کان لگائے رہے، یہی وجہ ہے کہ یہ دین ہمیشہ زندگی سے بھر پور اور مقبول ومحبوب رہا، انسانی معاشرہ کی قیادت کرتا رہا، اور اسلام کے دائرہ کے اندر صحیح راہ کی طرف رہنمائی کرتا رہا''۔ (کاروان زندگی۔ج ۴،ص۔۴۹ تا ۵۲)۔

عالم عربی کے حالات پر تنقید:

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولانا نے اپنی دعوت کا اصل میدان ابتدا سے ہی عرب دنیا کو بنایا جس کا خود بھی اظہار کیا، اور ظاہر ہے کہ عرصہ سے امت مسلمہ کو جس انقلاب کا انتظار ہے اس کی عربوں سے ہی امید کی جا سکتی ہے، اسی کے لئے مولانا نے سنجیدہ کوششیں کیں، بارہا تنقید کی بلکہ بسا اوقات تو تلاش میں رہے کہ کوئی موقع ہاتھ آئے اور اپنی بات رکھیں، اس سلسلہ میں جس جرأت، صراحت اور داعیانہ ذمہ داری کا ثبوت دیا اس کی نظیر نہیں ملتی۔

فی الحقیقت دوسرے لوگوں کو اس کا موقع بھی کم ملا، ۱۹۹۰ء میں جب عراق نے کویت پر حملہ کیا تو مولانا پر اس کا بہت اثر ہوا، اس کی مولانا نے بھر پور تنقید کی اوراس کے غلط ہونے کے متعدد اسباب بیان کئے، ان میں سے پہلا سبب یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''عراق کے جیسے بڑے اور طاقتور ملک نے جو حال ہی میں ایران جیسے عظیم و وسیع ملک سے جنگ میں کامیاب ہو چکا تھا، کویت کی جیسی چھوٹی ریاست پر حملہ اوراس پر قبضہ کر کے ایک ایسی خراب نظیر قائم کی جو نہ صرف یہ کہ اسلام کی اخلاقی تعلیم و روایات سے مطابقت نہیں رکھتی، بلکہ انسانی ضمیر اور اصول اخلاق کے لحاظ سے بھی ایک مذموم اقدام اور ''قزاقی'' کے مرادف ہے، پھر اس میں مزید سنگینی کا پہلو یہ ہے کہ حملہ آور ملک اور جس پر حملہ کیا گیا، دونوں مسلمان بھائی ہیں، اور عرب بھی، مزید برآں یہ کہ ایک ایسے ملک نے اس ریاست پر حملہ کیا اوراس پر قبضہ کیا، جس نے قریب ترین ماضی میں اس کی فیاضانہ مدد کی تھی، اور جس کا کوئی ایسا قصور نہ تھا، جس کی اس کو اس طرح سزا دی جائے۔'' (کاروان زندگی ج ۴ص ۲۷۴)۔

اس پیراگراف کو پڑھنے کے بعد اندازہ کیجئے کہ عربوں سے مولانا کو کیا امیدیں تھیں اور کتنا گہرا لگاؤ تھا اور کیوں نہ ہو اسلام کی کرن وہیں سے پھوٹی اور فی الاخیر اسلام وہیں باقی رہ جائے گا، بدأ الاسلام غريبا وسيعود غريبا فطوبىٰ للغرباء لیکن افسوس اس پر ہے کہ اب جبکہ شام اور مصر میں اسلام پسندوں کو کربناک سزائیں دی جارہی ہیں ان کا مستقبل تقریبا تاراج کیا جارہا ہے اور خود عرب انکا قتل عام کررہے ہیں بلکہ برسوں کی محنت اور انتظار کے بعد اٹھنے والی اس انقلابی لہر کو انسانی خون کے سمندر کی تہوں میں ڈبونے کے لئے خود پاسبانِ حرم بھی

پیش پیش ہیں، کیوں کہ اس اسلامی بیداری کی لہر کو ڈبو کر ہی حرمین کی آڑ میں اپنی گدی کی پاسبانی ممکن ہے، مصر پر اس تحریک کی حکومت قائم ہوئی جس کے متعلق مولانا ہی کے قلم سے یہ جملہ نکلا تھا ''لا یحبھم الا مؤمن ولا یبغضھم الا منافق'' (اخوان سے اسی کو محبت ہوگی جس کے دل میں ایمان ہے، اسکو نفرت ہوگی جس کے دل میں نفاق ہے) تو اس کو بے دردی سے اکھاڑ پھینکا گیا اور اس پورے ڈرامے میں سعودی حکومت کا گھناؤنا اور منافقانہ کردار رہا لیکن ہمارے اس ہندستان میں خاموشی رہی، چپ کا پیالہ پی لیا گیا، یقیناً اگر یہ اسد ربانی زندہ ہوتا تو اخوان کی حکومت کے قیام پر اس کا قلم جشن مناتا اور ناصحانہ مشورے دیتا اور عرب مما لک کی منافقانہ پالیسی پر ان کو تنبیہ کرتا، اور جب یہود و نصاری کے ساتھ ان کی سازشوں نے ان اسلام پسند انقلابیوں کو نگل لیا تھا تو یہ اللہ کا بندہ خون کے آنسو روتا اور اس کے قلم کی بجلیاں کوندتی نظر آتیں لیکن افسوس کہ ہندوستان کے آزاد علماء اس بڑی تعداد میں ہو کر بھی وہ کام نہ کر سکے جو کام وہ مرد حر اور مومن باصفا پوری زندگی تنہا کرتا رہا۔

اس سے زیادہ افسوس تو تب ہوا جب خاموشی کے ساتھ بعض مؤاخذہ و نقد کرنے والوں کا استہزا کیا گیا اور ان پر تیکھی تنقیدیں کی گئیں، یہی نہیں بلکہ اس موقع پر پوری امت دو فریقوں میں تقسیم ہوگئی، کچھ سعودیہ کے جرم کو ہدف ملامت بنانے لگے اور کچھ حج کی خدمت میں اس فعل شنیع کو چھپا کر مداحی کرنے لگے، اس موقع پر اس میں کوئی شک نہیں کہ مبالغہ ضرور ہوا لیکن اس میں کیا تردد کہ سعودیہ کا جرم اتنا بڑا تھا کہ اس پر پردہ ڈالنا ممکن نہ رہ گیا تھا، جس طرح اس حکومت نے عرب مما لک میں اسلامی لہر کو کچلنے اور محض اپنے اقتدار کی حفاظت کے لئے ظالموں کی پشت پناہی کرنے کا مظاہرہ کیا اس کو بہت پہلے اقبال نے خلافت سے بغاوت کرنے کے پس منظر میں ''عربوں کے دین مصطفیٰ بیچنے'' سے تعبیر کیا ہے، اور کچھ نے تو تب انتہاء کر دی جب دونوں صورتوں سے بچنے کیلئے خود اخوان کے موقف کو ہی غلط قرار دیا اور یہ کہہ دیا کہ اب اخوان کے نظریات وہ نہ رہے جو نظریہ اور طریقہ عمل وہ حضرت مولانا کی زندگی میں رکھتے تھے، یہ بات عجیب لگی کہ بعض انتہائی قابل و لائق اصحاب فکر و اہل قلم بھی اخوان کی سیاست کو دین سے الگ کر کے دیکھنے لگے، جبکہ یہ بات تاریخ میں محفوظ ہے کہ اخوان ابتدا سے ہی سیاسی نظریہ رکھتے ہیں، اور ان کا مقصد ہی کل اسلام کی نمائندگی ہے، کسی ایک شعبہ میں محدود ہو کر کام کرنے کے وہ قائل نہیں، بہر حال یہ وہی تحریک تھی جس کی خصوصیات شمار کرانے کے بعد اس پر ظلم کرنے والے حکمرانوں کے خلاف مولانا کے قلم نے اس طرح تاریخ رقم کی تھی:

''اس اہم دعوت (تحریک اخوان المسلمون) کے اثرات کو ختم کرنے کی کوشش کرنا جس نے عالم عربی کی نئی نسل میں اسلام کی سدا بہار صلاحیت اور اس کے دائمی ہونے کا اعتماد بحال کیا، جس نے جدید نسل کے دلوں میں ایمان کی نئی چنگاری روشن کی، ان کے احساس کمتری و شکست خوردگی کا مقابلہ کیا، جس سے بڑھ کر کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا، اس دعوت نے نوجوانوں کی بے راہ روی، ان کی اندرونی کمزوری اور ہوا و ہوس کے پیچھے دوڑنے کی ذہنیت کا مقابلہ کیا اور اس کے تن نازک میں جان ڈال دی، اور اقبال کے الفاظ میں۔

کبوتر کے تن نازک میں شاہین کا جگر پیدا

کا نقشہ کھینچ دیا، ان (حسن البناء شہید) کی اس دعوت سے جدید نسل تازہ دم ہوگئی، اس کی رگوں میں تازہ خون دوڑنے لگا، اور اس نے شجاعت و جوانمردی اور صبر و ثابت قدمی کا حیرت انگیز مظاہرہ کیا، اس تحریک کے اثرات کو ختم کرنے اور اس کے نقوش کو مٹانے کی کوشش اور اس کے چلانے والوں کو قید و بند اور جلا وطنی کی سزائیں، اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی اذیتیں وہ بدترین جرم ہے جس کو تاریخ کبھی معاف نہیں کر سکتی، یہ ایسا المیہ ہے، جس کو عالم اسلام کبھی فراموش نہیں کر سکتا، یہ عالم عربی کے ساتھ اتنا بڑا ظلم ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی اور ظلم نہیں ہو سکتا، اس جرم کا کفارہ ملک کی کسی بڑی سے بڑی تعمیری و سیاسی خدمت سے نہیں ادا کیا جا سکتا، یہ اتنا وحشت ناک جرم ہے، کہ جس کی مثال صرف تاتاریوں کی وحشت و بربریت یا قدیم مسیحی دنیا کے دور تعصب میں ملتی ہے،'' (پرانے چراغ حصہ ۳ ص ۲۲)۔

(...... جاری) ☆☆☆

نقد ونظر

راشد شاز اور غزوۂ بنو قریظہ

غزوۂ بنوقریظہ کے سلسلہ میں راشد شاذ کے افکار کا تنقیدی جائزہ

محمد غزالی ندوی
mohammadghazali@hotmail.com

شاز صاحب نے اسلامی تاریخ کے بہت سے اہم اور مسلمہ واقعات کا انکار کیا ہے اور انہیں فسانہ ثابت کر نے کی کوشش کی ہے۔ وہ اسراء ومعراج کے بھی منکر ہیں، اور مسجد اقصی کے قبلۂ اولی ہونے کے بھی، اسی طرح وہ یہودیوں سے مزاحمت کے بھی قائل نہیں ہیں۔ پچھلے شماروں میں ہم ان افکار پر مفصل تبصرہ کر چکے ہیں۔ اس مضمون میں ہم ان کی اس فکر پر مناقشہ ومحاکمہ کرنا چاہتے ہیں جس کا ماحصل یہ ہے کہ غزوۂ بنو قریظہ ایک خود تراشیدہ افسانہ ہے اور اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ شاز صاحب لکھتے ہیں:

''ہم جب تک ﴿کونوا ربانیین﴾ کے نقیب رہے ہمارے دل ودماغ اہل کتاب کے سلسلہ میں کسی تحفظ ذہنی سے خالی رہے، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام کی حکومتوں میں حتی کہ عہد عبدالملک تک انتظامی عہدوں پر خصوصا دفتری اور مالیاتی امور میں اہل کتاب کے اصحاب فن کو مأمور کرنے میں مسلمانوں نے کسی ادنیٰ تحفظ ذہنی کا مظاہرہ بھی نہ کیا، البتہ جب عہد عبدالملک میں رسالۂ محمدی کا سیاسی قالب ایک عرب امپائر میں متشکل ہونے لگا اور آگے چل کر عہد عباسی میں شعوبیہ تحریک نے عرب وعجم، قریشی وغیر قریشی، مسلم اور غیر مسلم کے مابین چپقلش تیز کر دی تو ایمانی طائفوں کے سلسلہ میں ہماری وسعت نظری بھی متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی، یہی عہد ہے جب پہلی بار بنو قریظہ کے چھ سو اہل یہود کے قتل کا فسانہ تاریخ کی زینت بنا''۔ (راشد شاز ادراک زوال امت، ملی پبلیکیشنز نئی دہلی 2011 ج ۲ / ص ۴۹۷)۔

ایک دوسری جگہ مزید وضاحت سے وہ لکھتے ہیں:

جب عباسی بغداد میں اقوام غیر کے باصلاحیت افراد کا غلبہ محسوس ہونے لگا تو اس صورت حال کے مداوا کے لیے ایسی روایتیں وجود میں آئیں جو مسلم حکمرانوں کی وسیع القلبی پر لگام لگا سکیں، ہمارے خیال میں اہل کتاب کے سلسلہ میں اس قسم کی تمام روایتیں جو انہیں اجنبی عامل کی حیثیت سے دیکھنا چاہتی ہیں اسی عہد میں منظر عام پر آئیں جن میں سب سے اہم واقعہ بنو قریظہ کے قتل کا ہے جو آنے والے دنوں میں تاریخی مصادر میں نقل در نقل کے باعث استناد کے درجے کو پہنچ گیا ہے، حالانکہ یہ واقعہ نہ تو درایت پر پورا اترتا ہے اور نہ ہی معمولی درجے کی تاریخی تنقیح اسے

صحیح قرار دے سکتی ہے، جب بنوقریظہ جیسا فسانہ ہمارے تاریخی ادب میں اس طرح در آسکتا ہے کہ وہ آنے والی صدیوں میں رحمۃ للعالمین کی شبیہ کو متأثر کرے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس قبیل کے نہ جانے کتنے چھوٹے بڑے واقعات نے ہمارے تاریخی مصادر میں اپنی جگہ بنائی ہوگی''۔(راشد شاز ۔اسلام :مسلم ذہن کی تشکیل جدید 2008 نئی دہلی)

ازالہ: علم کی کمی انسان سے کتنی ہمالیائی غلطیاں کرواتی ہیں اس کا اندازہ مذکورہ بالا تحریر میں کیا جا سکتا ہے، شاز صاحب نے اگر ایک مرتبہ بھی زندگی میں قرآن مکمل پڑھا ہوتا تو وہ جانتے کہ بنوقریظہ کے قتل کے جس واقعہ کو وہ عہد عباسی میں تراشیدہ فسانہ قرار دے رہے ہیں، وہ عہد نبوی میں پیش آنے والا وہ واقعہ ہے جس کو خود قرآن نے بیان کیا ہے، غزوۂ بنوقریظہ غزوۂ خندق کے بعد پیش آیا تھا، جس کی وجہ یہ تھی کہ غزوۂ خندق میں جب مسلمانوں پر عرب کے مختلف قبائل ٹوٹ پڑے تھے تو مدینہ میں داخل ہونے سے ان کو روکنے کے لیے رسول اللہ ﷺ نے خندق کھدوادی تھی، ایسی پرخطر صورت حال میں بنوقریظہ نے جو مدینہ کے اندر تھے مسلمانوں سے بد عہدی کرکے کفار سے ساز باز کر لی تھی اور ان کی معاونت کی تھی۔ جس قلعہ میں مسلمان عورتوں کو حفاظت کی خاطر رکھا گیا تھا اس پر دھاوا بولنے کی منصوبہ بندی بھی کی تھی۔ اس وجہ سے جب کفار کا لشکر واپس چلا گیا تو اللہ کے رسول ﷺ نے اندر کے دشمنوں سے نپٹنے کا فیصلہ کیا، آپ ان کی طرف تشریف لے گئے تو وہ اپنے قلعوں میں محصور ہو گئے، آخر کار جب نکلے تو انہوں نے یہ فرمائش کی کہ ان کا فیصلہ سعد بن معاذ کے سپرد کیا جائے، سعد بن معاذ نے یہ فیصلہ کیا کہ ان کے بالغ مرد قتل کر دئے جائیں اور بچوں اور عورتوں کو اسیر بنا لیا جائے، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

قرآن پاک نے سورۂ احزاب میں غزوۂ احزاب (غزوۂ خندق) کا تفصیلی تذکرہ کرتے ہوئے صاف طور پر اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ یہودیوں نے اس موقع پر کفار کی معاونت کی تھی جس کی ان کو عبرتناک سزا دی گئی کہ کچھ کو قتل کر دیا گیا، کچھ کو قیدی بنا لیا گیا، ان کے گھروں ان کے علاقوں اور ان کے مال کو اپنے قبضہ میں لے لیا گیا۔ بقول قرآن ﴿وَرَدَّ اللَّـهُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوا خَيْراً وَكَفَى اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ الْقِتَالَ وَكَانَ اللَّـهُ قَوِيّاً عَزِيزاً۔ وَأَنزَلَ الَّذِينَ ظَاهَرُوهُم مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِن صَيَاصِيهِمْ وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيقاً تَقْتُلُونَ وَتَأْسِرُونَ فَرِيقاً۔ وَأَوْرَثَكُمْ أَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ وَأَرْضاً لَّمْ تَطَؤُوهَا وَكَانَ اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيراً﴾ (الأحزاب، ۲۵،۲۷)

ترجمہ: ''اللہ نے کفار کا منہ پھیر دیا وہ کوئی فائدہ حاصل کیے بغیر اپنے دل کی جلن لیے یوں ہی پلٹ گئے، اور مؤمنین کی طرف سے اللہ ہی لڑنے کے لیے کافی ہو گیا، اللہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے۔ پھر اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے ان حملہ آوروں کا ساتھ دیا تھا اللہ ان کی گڑھیوں سے انہیں اتار لایا اور ان کے دلوں میں اس

نے ایسا رعب ڈال دیا کہ آج ان میں سے ایک گروہ کو تم قتل کررہے ہو اور دوسرے گروہ کو قید کررہے ہو۔اس نے تم کو ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے اموال کا وارث بنادیا اور وہ علاقہ تمہیں دیا جسے تم نے کبھی پامال نہ کیا تھا۔اللہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

قرآن کا مذکورہ بالا بیان پڑھیے اور شاذ صاحب سے پوچھئے کہ کیا یہ ساری آیات بھی عہد عباسی کی تراشیدہ ہیں۔اور اگر تراشیدہ نہیں ہیں تو ان آیات میں کن اہل کتاب کو قتل کرنے،قیدی بنانے اور ان کے مال وجائداد پر قبضہ کا ذکر ہے؟

شاذ صاحب ان واقعات کو لاکھ فسانہ قرار دیں لیکن قرآن نے ان واقعات کو نقل کرکے رہتی دنیا تک کے لیے ان کو معتبر کردیا ہے، بنو قریظہ ہی پر بس نہیں ایک دوسرے یہودی قبیلہ بنونظیر کی عبرتناک سزا کا تذکرہ بھی قرآن نے کیا ہے:﴿هُوَ الَّذِیْ أَخْرَجَ الَّذِیْنَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِن دِیَارِهِمْ لِأَوَّلِ الْحَشْرِ مَا ظَنَنتُمْ أَن يَخْرُجُوا وَظَنُّوا أَنَّهُم مَّانِعَتُهُمْ حُصُونُهُم مِّنَ اللَّهِ فَأَتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوا وَقَذَفَ فِیْ قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُونَ بُيُوتَهُم بِأَيْدِيهِمْ وَأَيْدِیْ الْمُؤْمِنِيْنَ فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِیْ الْأَبْصَارِ وَلَوْلَا أَن كَتَبَ اللَّهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَاء لَعَذَّبَهُمْ فِیْ الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِیْ الْآخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ شَاقُّوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَمَن يُشَاقِّ اللَّهَ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ [الحشر ۲،٤] ترجمہ:''وہی ہے جس نے اہل کتاب کافروں کو پہلے ہی حملے میں ان کے گھروں سے نکال باہر کیا۔تمہیں ہرگز یہ گمان نہ تھا کہ وہ نکل جائیں گے اور وہ بھی یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ ان کی گڑھیاں انہیں اللہ سے بچا لیں گی۔مگر اللہ ایسے رخ سے ان پر آیا جدھر ان کا خیال بھی نہ گیا تھا۔اس نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے بھی اپنے گھروں کو برباد کررہے تھے اور مؤمنوں کے ہاتھوں بھی برباد کروارہے تھے۔پس عبرت حاصل کرو اے دیدۂ بینا رکھنے والو!اگر اللہ نے ان کے حق میں جلاوطنی نہ لکھ دی ہوتی تو دنیا ہی میں وہ انہیں عذاب دے ڈالتا اور آخرت میں تو ان کے لیے دوزخ کا عذاب ہے ہی۔یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ کیا اور جو بھی اللہ کا مقابلہ کرے اللہ اس کو سزا دینے میں بہت سخت ہے''۔

شاذ صاحب بتائیں کہ کیا یہ قرآنی آیات بھی عہد عباسی میں مسلمان حکمرانوں کی وسعت نظری کو لگام دینے کے لیے تراشی گئی ہیں۔اور جب ان کے بقول یہود بنی قریظہ کے قتل کی احادیث وروایات رحمۃ عالمین کی شبیہ کو متأثر کرتی ہیں،تو پھر مذکورہ بالا آیات جن میں یہود بنی قریظہ کے قتل اور یہود بنی نظیر کی جلاوطنی کا مفصل تذکرہ ہے وہ بھی شاذ صاحب کی منطق سے رحمۃ للعالمین کی شبیہ کو متأثر کرنے والی قرار پائیں گی، شاذ صاحب ان آیات کو قرآن سے خارج کرنے اور دور عباسی میں بنائی ہوئی آیات ثابت کرنے کی مہم کب سے چلائیں گے؟۔

☆☆☆

دعوت عمل

اہل دانش، قلم ہاتھ میں لیں

مفتی انور خاں سرگروہ
ksmanwar@gmail.com

ایک وقت تھا، کہ انسانیت کے ہمدرد لوگ، عام انسانوں کی خدمت کرتے کرتے قائد بنا دئے جاتے تھے، برصغیر کی جنگ آزادی کے، کئی نامور لوگ ایسے تھے، جو انگریزی حکومت کیخلاف، اس وجہ سے میدان میں اترے تھے، کہ انگریز ظالم تھے، اور وہ کالے اور گورے کی تفریق کے ماننے والے تھے، گوروں کا اکرام اور کالوں کے انہدام کے قائل تھے، انہوں نے اپنی رنگت کے زعم میں گندمی اور زرد رنگت کو بھی کالا رنگ قرار دیا تھا۔ چنانچہ کئی ایک قدآور شخصیتیں، اپنی عزتِ نفس اور انسانیت کی اس درجہ پستی اور ذلت کو، طبعاً برداشت نہیں کرسکتے تھے، اس بنا پر وہ انگریزوں کے آمنے سامنے کھڑے ہوگئے، اور برطانیہ کو ہر سڑک، ہر شہر اور ہر صوبے میں للکارا ہے۔۔۔ اس حقیقت کو مدنظر رکھیں کہ، موہن داس گاندھی کو، کالی رنگت اور انڈین ہونے کی پاداش میں، اگر ٹرین کے فرسٹ کلاس ڈبے سے، دھکے دے کے نہ پھینکا جاتا، تو شاید وہ ایک عام ایڈووکیٹ کی حیثیت سے جیتے اور مرکھپ جاتے۔۔۔ اسی طرح اگر عزتِ نفس کے باب میں، محمد علی جناح، نرگسی انا کے خوگر نہ ہوتے، تو وہ، بدستور ایک کامیاب وکیل ہوتے۔۔۔ کم و بیش یہی حال، برصغیر کے اکثر و بیشتر لیڈروں کا تھا، وہ انگریزوں کے ہاتھوں، آدمیت کی بے توقیری اور انسانی حقوق کی پامالی برداشت نہیں کرسکتے تھے، اسی لئے وہ میدان میں آئے، صف میں کھڑے ہوگئے، رفتہ رفتہ پہلی صف میں آئے، اور ہوتے ہواتے مصلے پہ پہنچ کے امام ہوگئے، آزادی کے متوالے اسی ترتیب سے آگے بڑھے ہیں۔ وہ کسی طے شدہ پلان کے تحت، اپنے نجی مفاد کی خاطر، قیادت کے مورچے میں دخیل نہیں ہوئے تھے۔ البتہ ان سبھی میں، ایک قدر مشترک تھی، کہ وہ اعلی تعلیم یافتہ اور قیادت کی فطری صلاحیتوں والے تھے، ایک موقع پر برطانوی وائسرائے لارڈ ویول نے لکھا ہے، کہ برصغیر کے لیڈروں کے ساتھ، سہل اور سیدھی بات چیت ممکن نہیں ہے، کیونکہ، ان میں اکثریت وکلاء کی ہے۔ بات چونکہ انسانی وقار کی سیاست اور آدمیت کے بنیادی حقوق کی چلی ہے، اسلئے سیاسی شعور کے تذکرہ کے بغیر مدعا حاصل نہ ہوگا، پچھلی صدی کے اوراق اٹھا کے دیکھیں، تو آج کے حالات کے مدنظر، بہتوں کو حیرت ہوگی، کہ انگریزوں کیخلاف، خالص سیاسی اور مبنی بر تدبیر موقف، اس وقت کے بیدار اور پالیٹکل سائنس کے رمزشناس علماء رہے ہیں، شیخ الاسلام کے بقول انگریزوں سے ہندوؤں کی لڑائی، وطنیت کی بنیاد پر ہے، جبکہ انگریزوں سے مسلمانوں کی لڑائی، وطنیت کے ساتھ شریعت کی بنیاد پر ہے۔ شیخ الہند نے اس جدوجہد کو عالمی سطح پر استوار کرکے

اتحادی سیاست اور خارج سے ظالم کا پنجہ مروڑنے کی مثال قائم فرمائی۔ انہوں نے افغانستان میں، متفق الخیال ہندوؤں کے ہمراہ، ایک عبوری حکومت قائم کی اور خلافتِ عثمانیہ کے پاشاؤں سے ملکر، انگریزوں کا ناطقہ بند کرنے کی عملی تدبیریں کیں۔ جنگ آزادی کے اگلے پڑاؤ میں، انہی سے تحریک حاصل کرکے، سبھاش چندر بوس نے، ملک کے باہر عسکری فوج تشکیل دی تھی۔ انگریزوں کے بارے میں، اس عہد کے علماء کا پالیٹکل نظریہ، آئینہ کی طرح بے داغ تھا۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز نے انگریزوں کیخلاف ایسے عہد میں فتویٰ صادر کیا، جب، اُن فرنگیوں کا دنیا میں طوطی بولتا تھا، اور ابھی دوسری جنگِ عظیم کے سبب، انگریزوں کی کمر نہیں ٹوٹی تھی۔ شاہ صاحب کی سیاسی بصیرت کے لحاظ سے انگریز، بھارت کے فطری باشندے نہیں ہوسکتے تھے، کیونکہ وہ تاجر اور بنیا طبیعت کے حامل تھے، اور سات سمندر پار سے بھی، برطانیہ سے نظریاتی اور متکبرانہ وابستگی رکھتے تھے، برہمن میں ذات پات کے غرور کے وائرس بھی اسی لئے ہیں کہ یہ بھی، یوروپ سے سفر کرتے ہوئے بھارت پر حملہ آور ہوئے ہیں۔ غرض یہ کہ، انگریز قوم ہندوستان کے وسائل سے برطانیہ کی خوشحالی کے پابند تھی، ہند اور ہندوستانیوں سے ان کو اسی قدر تعلق تھا جیسا تعلق، سامان کے مالک کو قلی سے ہوتا ہے۔ اکبر الہ آبادی نے تقوی کی تعریف میں کہا تھا، کہ، دنیاداری سے مسلمان کو اسی قدر لین دین رکھنا چاہئے، جتنا انگریز کسی ہندوستانی سے تعلق رکھتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ انگریزوں کیخلاف، علماء کا موقف، صرف جذباتی اور وقتی ٹیس کے سبب، رونما ہونے والے ردعمل کا نہ تھا۔ بلکہ مکمل بصیرت اور منصوبہ بندی کے سبب تھا۔ اسی سیاسی بیدار مغزی اور روایتی اقدام پسندی کے اثر سے، جمعیت نے، سب سے پہلے بے خطر ہوکے مکمل آزادی کا نعرہ بلند کیا، بعدازاں کانگریس نے راوی کے کنارے مکمل آزادی کی قرارداد پاس کی ہے، جبکہ اسوقت تک کانگریس، مرحلہ وار معاشرتی اصلاحات اور سول مطالبات کے دور سے گزر رہی تھی۔۔۔ آج کے دور میں، بحیثیت معاشرہ کے ایک اعلی تعلیم یافتہ اور دونوں طرف کے علوم وفنون میں مہارت کی طبعی صلاحیت رکھنے کے سبب، جوان علماء کی اسی سابقہ حیثیت کے بحال ہونے کا وقت آچکا ہے، جہاں نوجوان علماء دیگر معاصر تعلیم میں دلچسپی لے رہے ہیں، وہیں انہیں ملک وانسانیت کی وسیع خدمات کیلئے، پالیٹکل سائنس کو بطور ایک ہنر کے سیکھنا ہوگا، تاکہ وہ اقدامی جذبات سے لبریز اور افکار کے برملا اظہار کے پابند ہوسکیں، اور اس میدان میں بھیڑ کی چال اور مداہنت سے پاک، سیاسی اقدامات کیلئے، متعلق پارٹی کو قائل کرسکیں۔ یہ بہت عار کی بات ہے کہ ماضی کے مارگ درشک، آج روایتی مہامارگ پر چلتے چلے جارہے ہیں۔ آجکل انڈیا ناو کے ارنب گوسوامی اور این ڈی ٹی وی کی برکھادت کے درمیان، قوم پرستی کے عنوان پر چپقلش چل رہی ہے، گوسوامی اور اس قماش کے میڈیا کا بڑا حلقہ، وطن دوستی کے اپنے پیمانے وضع کرتا ہے، اور دوسروں کو اس پیمانہ پر آنکتا ہے، یہ لوگ وطن دوستی کے نام پر، مخالف افکار ونظریات کو کٹہرے میں کھڑا کرکے، ملک کو برہمنی فاشزم کے راستے پہ دھکیلنا چاہتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو وقتاً فوقتاً دارالقضاء کو عدالت کے متوازی ایک عدالت کہتے نہیں تھکتے ہیں، مگر میڈیا ٹرائل میں کسی بھی شہری کو عدالت میں جانے سے پہلے مجرم ثابت کرتے ہیں، اس تناظر میں یہ حلقہ ملکی عدالت پر ناجائز دباؤ بنانے کا مجرم ہے، لہٰذا میڈیا ٹرائل چلاکر، ملکی قانون کو یرغمال بنانے کی پاداش میں ان صحافیوں پر، ملک وعوام کے مفاد پہ شبخون مارنے کا مقدمہ چلنا چاہئے۔ برصغیر کی آزادی، فرانس کی طرح فری میسنز کے ہتھے نہ چڑھ سکی، (**بقیہ صفحہ نمبر ٦٤ پر**......)

خیر مقدم

شراب بندی قانون ۲۰۱۶ء

مفتی ثناء الہدی قاسمی

وزیر اعلیٰ جناب نتیش کمار، اوران کی حلیف جماعتوں نے متحد ہو کر شراب بندی قانون ۲۰۱۶ء کو بہار اسمبلی سے پاس کروالیا ہے، یہ قانون اسی سال مارچ میں نافذ کیے گیے سرکاری قانون کی جگہ لے گا، اس قانون میں شراب پینے والے، شراب گھر میں رکھنے والے، شراب کی خرید وفروخت کرنے والے حتی کہ شراب کی بو تلیں گھر پر پائے جانے کی صورت میں بھی سخت سزا کی بات کہی گئی ہے، اس سلسلے میں ہونے والی گرفتاری غیر ضمانتی ہوگی، اس قانون کے مطابق اگر کوئی آدمی اپنے گھر میں کسی فرد کو شراب پینے کی اجازت دیتا ہے تو گھر کے مالک کو دس سال سے لے کر عمر قید تک کی سزادی جا سکتی ہے، اسی طرح کوئی آدمی شراب پیتا ہوا پکڑا جائے گا تو اسے پانچ سے سات سال کی سزا اور ایک لاکھ روپیہ جرمانہ بھی دینا ہوگا، گھر میں شراب پائے جانے کی صورت میں یہ بہانہ بھی کارگر نہیں ہوگا کہ دوسرے فرد نے رکھا اور اس رکھی ہوئی شراب سے مالک مکان کا کچھ لینا دینا نہیں ہے، بلکہ گھر کے سارے بالغ مرد وعورت کو شراب پائے جانے کی سزا ملے گی، البتہ نابالغ بچے اس قانون کے تحت داخل نہیں ہوں گے، اس قانون کے پاس ہونے سے قبل اسمبلی میں چار گھنٹے تک زوردار بحث چلی، حکمراں جماعتوں نے اس کی حمایت میں زوردار بحثیں کیں، جبکہ حزب اختلاف نے اس قانون کی سختی کو سامنے رکھ کر اسے کالا قانون قرار دیا اور اس کے نتیجہ میں پولس کی حکومت قائم ہونے کا اندیشہ جتایا، حزب اختلاف کے رہنماؤں نے اس بات پر بھی اعتراض کیا کہ گھر میں شراب ملنے پر سبھی بالغ مرد ذمہ دار کیسے قرار دیے جا سکتے ہیں، انہوں نے کہا کہ ریاست میں شراب کے کاروباری بے روزگار ہو جائیں گے، اعتراض یہ بھی تھا کہ ریاست میں شراب بندی ہوگی اور ریاست میں شراب کے کارخانے حسب سابق چلتے رہیں گے اور دوسری ریاستوں کو یہاں سے شراب کی سپلائی جاری رہے گی، اس لئے قانون میں ترمیم ہونی چاہیے، حزب اختلاف نے اٹھارہ ترمیمات پیش کیں دو بار ووٹنگ ہوئی اور دونوں بار حکمراں طبقے کی جیت ہوئی، چنانچہ پہلی بار 46 کے مقابلے 150 اور دوسری بار 45 کے مقابلے 53 اووت سے حکومت نے ترمیمات کو رد کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

اس بل کو پاس کرانے میں در اصل وزیر اعلیٰ کے پختہ ارادے کو بڑا دخل تھا، انہوں نے اپنی تقریر میں یہاں تک کہہ دیا کہ لوگوں کو شراب پینے کا نشہ ہوتا ہے، مجھے شراب بند کرانے کا نشہ ہے، انہوں نے اپنی تقریر میں حزب اختلاف کے سارے اعتراض کا جواب سنجیدگی اور منطقی پہلوؤں کو سامنے رکھ کر دیا، انہوں نے کہا کہ یہ کالا قانون کیوں کر ہو سکتا ہے، جبکہ اس قانون میں بھی سزا کی وہی تجویز ہے، جو گذشتہ مارچ کے بجٹ سیشن میں پیش کیے گیے قانون میں تھی، اس لئے قانون پر ہائے توبہ اور واویلا مچانے کی بات سمجھ میں نہیں آتی، سب کو مجرم قرار دینے کی بات اس لیے رکھی گئی ہے، تاکہ نابالغ بچوں اور عورتوں کو اس کام میں استعمال کرنے سے روکا جا سکے، یہ شراب کے استعمال کو اجتماعی طور پر ناقابل قبول بنانے کی طرف ایک قدم ہے، گھر میں شراب آئے گی تو بیٹا چلائے گا، بیوی

روئے گی ، بیٹی منع کرے گی تو گھر کا کوئی فرد شراب پینے کی جرأت نہیں کر سکے گا، انہوں نے کہا کہ حکومت کی منشا شراب کے کاروباریوں کو بے روزگار کرنے کی نہیں ہے بلکہ ان کو روزگار کے مواقع فراہم کرانے کے لئے حکومت پابند عہد ہے، اسی لیے حکومت نے 1900 شراب کے کاروباریوں کو سدھا کی دوکانیں کھولنے کی پیش کش کی ہے لیکن ابھی صرف 60 کاروباریوں نے اس پیش کش کو قبول کیا ہے ، 34 نے سدھا کے سنٹر کا آغاز کر دیا ہے، انہوں نے کہا کہ جو فیکٹریاں چل رہی ہیں ان کو بند کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ عدالت کے ذریعہ معاوضہ طلب کریں گے۔ بہار ایک غریب ریاست ہے اس کے لیے معاوضہ دینا ممکن نہیں ہوگا، اس لیے ان فیکٹریوں کو بند نہیں کیا جا سکتا، وزیر اعلیٰ کی اس تقریر کا کوئی اثر حزب مخالف پر نہیں ہوا، اور وہ اسمبلی سے واک آؤٹ کر گئے اور اس بل کی مخالفت میں گورنر ہاؤس تک مارچ کیا۔

اس بل کے آنے سے مسلمانوں کو خاص طور سے خوشی ہوئی، خوشی کی وجہ یہ ہے کہ امارت شرعیہ کا حکومت سے یہ دیرینہ مطالبہ تھا کہ شراب پر پابندی لگنی چاہیے، امیر شریعت سادس حضرت مولانا سید نظام الدین صاحبؒ کے بارے میں یہ بات مشہور تھی کہ وہ ہر ملاقات میں شراب کے مسئلے کو ضرور چھیڑتے تھے، حضرت امیر شریعت نے نتیش جی کے پہلے دور حکومت میں فراخ دلی سے شراب کی خرید وفروخت کے لائسنس دینے کی بھی مذمت کی تھی، حضرت امیر شریعت مرحوم کے نزدیک قانونی اور غیر قانونی شراب کی فروختگی کی تقسیم بھی بے معنی تھی وہ کہا کرتے تھے کہ قتل تو قتل ہے اس کے قانونی اور غیر قانونی ہونے سے انسانی جان کے ضیاع پر کیا فرق پڑتا ہے، ویسے ہی شراب کی خرید وفروخت قانون ہو یا غیر قانونی وہ انسانی ذہن ودماغ کو ہر حال میں برباد کر دیتا ہے، اس لیے اس پر پابندی لگنی ہی چاہیے، تمام مسلمان اس مسئلے پر ایک رائے ہیں اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جس میں شراب پینے ، پلانے ، لانے لے جانے ، بنانے ، بیچنے خریدنے سب کی ممانعت آئی ہے، یہ قانون بڑی حد تک اسلامی تعلیمات سے میل کھاتا نظر آتا ہے، یہ بل ایک مسلمان وزیر عبدالجلیل مستان نے پیش کیا یہ ہمارے لیے مزید مسرت کا باعث ہے، ہمیں بہت اچھی طرح یاد ہے کہ جب پہلے دور حکومت میں نتیش جی نے ایک مسلمان کو وزیر آبکاری بنایا تھا تو وہ حضرت امیر شریعت سادس سے مشورہ لینے امارت شرعیہ آئے تھے، اور اس محکمہ کے بارے میں حضرت کی رائے جاننا چاہی تھی ، حضرت نے بغیر ان کے عہدہ کا خیال کئے جو ہمارے امراء شریعت کی شان رہی ہے، فرمایا کہ یہ وزارت ایک مسلمان کے شایان شان نہیں ہے، حضرت کی اس رائے کی روشنی میں ہی کچھ دنوں بعد اس وزارت سے انہوں نے استعفیٰ دیدیا ، ممکن ہے کچھ دوسری وجوہات بھی رہی ہوں، لیکن ان کے استعفیٰ کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی۔

جہاں تک اس قانون کے تجزیہ کا تعلق ہے تو صحیح یہ ہے کہ حزب اختلاف کے سب تو نہیں؛ البتہ بہت سارے اعتراضات اپنی جگہ صحیح ہیں، فیصلے چونکہ قلت وکثرت کی بنیاد پر ہوتے ہیں، یہاں سر ہی کے گننے کا رواج ہے اور اسمبلی میں حکومتی جماعت کو واضح اکثریت حاصل ہے، اس لیے بہت ساری ترمیمات جو صحیح تھیں وہ بھی رد ہو گئیں اور حکومت کی سیاسی نقطۂ نظر سے یہ بڑی کامیابی سمجھی جا رہی ہے۔

مثلاً کسی ایک فرد کے شراب پینے کی بنیاد پر پورے گھر کو مجرم کے خانے میں ڈال دینا صحیح نہیں معلوم ہوتا ، اسی طرح شراب کی بوتلوں کی موجودگی کو پینے کے قائم مقام قرار دے کر سزا کا موجب ٹھہرانا صحیح نہیں ہے، پہلے گولہ بارود اور غیر قانونی ہتھیار دکھا کر لوگ اپنے مخالفین کو ٹھکانے لگاتے تھے، اب چند بوتلیں گھر میں ڈال کر ہی اپنے مخالفین کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دینے کا کام آسان ہو جائے گا، ہمارا محکمہ پولس جو پہلے سے ہی بدنام ہے اس کو بھی پھلنے پھولنے اور اپنے جوہر دکھانے کے کافی مواقع دستیاب ہوں گے، کل ملا کر ان دفعات کے ذریعہ ہر وقت دہشت کا ماحول بنا رہے گا، اسی طرح یہ کتنی عجیب وغریب بات ہے کہ

بہار کی سرزمین پر شراب بنائی تو جائے گی، لیکن یہاں پینا پلا نا منع ہوگا، دوسری ریاستوں میں اس کی سپلائی ہوگی، تو کیا ہم دوسری ریاستوں کی عوام کے لیے اسے مفید سمجھتے ہیں؟ جس طرح بہار کی عوام کو شراب کی لعنت سے بچانا ہے اسی طرح دوسری ریاستوں کی عوام کے ذہن ودماغ کا تحفظ بھی ہماری ذمہ داری ہے، اس لیے شراب بندی کے اس قانون میں یہاں کی شراب بنانے والی فیکٹریوں کے بند کرنے کی تجویز بھی ہونی چاہیے تھی، اور یہ کہنا کہ بہار جیسی غریب ریاست ان فیکٹریوں کو بند کرنے کی صورت میں معاوضہ نہیں دے پائے گی، صحیح نہیں، شراب کے کاروبار سے جو ٹیکس آتا تھا وہ ریاست کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ تھا، اس ٹیکس کے بند ہوجانے سے بہار کی معاشیات پر کوئی اثر نہیں پڑا، ویسے ہی اس اچھے کام کے لیے حکومت چاہے تو معاوضہ کی ادائیگی کی شکل بھی بن سکتی ہے، ضرورت حکومت کے ارادے کی ہے، ارادہ فیکٹریوں کے ہٹانے کا نہ ہو تو بقول شاعر ۔

''تو ہی اگر نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں۔''

تاڑی کو نشہ سے پاک کرکے نیرا تیار کرنے کی بات بھی وزیر اعلیٰ نے کہی ہے، تاڑی کو مختلف مراحل سے گذارنے کے بعد نیرا تیار ہوتی ہے، اس نیرا کا استعمال گڑ، پیرا اور آئس کریم وغیرہ میں کرکے اسے زیادہ مفید بنایا جا سکتا ہے، اور اس نئی پیداوار سے پاسی سماج میں روزگار کے مواقع بھی بڑھیں گے، اور ان کی معاشی حالت میں سدھار ہوگا، حکومت نے امید ظاہر کی ہے کہ اگلے سال بیساکھ تک نیرا کی پیداوار شروع کرالی جائے گی۔

وزیر اعلیٰ نے یہ بات واضح کی ہے کہ تاڑی اور گانجہ پر سے سرکار پابندیاں ہٹائے گی اور اس کے لئے جلد ہی آرڈیننس جاری کیا جائے گا، تاڑی، گانجہ بھانگ، افیم، ہیروئن، چرس اور اس قسم کی دوسری اشیاء بھی نشہ آور ہی ہیں اور ان کے استعمال سے ذہن ودماغ، عقل وشعور اور جسم کو نقصان پہونچتا ہے، اس لیے صحیح بات تو یہی ہے کہ ان چیزوں کو بھی اس قانون کے دائرہ میں لانا چاہیے، لیکن اس سلسلے میں شاید وزیر اعلیٰ اپنی حلیف جماعت آر جے ڈی سپریمو لالو پرساد کی رائے سے اختلاف کرنے کی جرأت نہ کرسکے یا پھر وہ رام بلاس پاسوان کے ذریعہ تاڑی پر پابندی کے خلاف تحریک چلانے کے اعلان سے ڈر گئے، اسی وجہ سے اعلان کیا کہ ''نیرا'' کی پیداوار شروع ہونے تک تاڑی کی خرید بکری پر پابندی نہیں رہے گی اور ۱۹۹۱ء کا قانون تاڑی پر لاگو ہوگا، البتہ چوک چوراہوں، ہاٹ، بازاروں مذہبی جگہوں اور تعلیمی اداروں کے سامنے اس کی کھلے عام خرید وفروخت نہیں کی جا سکے گی، البتہ انفرادی طور پر تاڑی کے استعمال پر پابندی نہیں ہوگی۔ ایجنسیوں کے مستعد اور چارج شیٹ کے صحیح سے داخل نہ کرنے کی وجہ سے قانون کی سختی کے باوجود ۳۴۱۳ لوگ ضمانت پانے میں کامیاب ہو گئے ہیں، ان لوگوں کو شراب پینے اور شراب رکھنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا 6256 لوگ اب بھی ضمانت پانے کے لیے تگ ودو میں لگے ہوئے ہیں۔

کل ملا کر دیکھیں تو بعض کمی کوتاہیوں کے باوجود جو انسانی قانون کا خاصہ ہے، اس قانون سے ہر سطح پر شراب بندی میں مدد ملے گی، بشرطیکہ خلوص کے ساتھ اس قانون پر عمل کیا جائے، ہمارے یہاں قانون بنتے رہتے ہیں، شراب بندی کا قانون کرپوری ٹھاکر کے دور میں بھی بنا تھا، لیکن جن سنگھیوں نے اسے چلنے نہیں دیا اور واویلا اتنا مچا کہ کرپوری حکومت ہی گر گئی، اس بار ایسا کوئی خطرہ تو نہیں ہے، لیکن قانون کو نافذ کرنے والی مشنری پر بھی نگاہ رکھنی ہوگی کہ وہ اس کام میں کس قدر مستعد ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مارچ ۲۰۱۶ء سے اب تک اس قانون کے نفاذ سے سماج کو بڑا فائدہ پہونچا ہے۔ ۱/اپریل ۲۰۱۶ء سے ۲۵/ جولائی ۲۰۱۶ء تک 12.7 فی صد جرائم کم ہوئے ہیں، جرائم کی نوعیت کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈکیتی میں 31 لوٹ میں 15، اغوا میں 54، فساد میں 40، زنا بالجبر میں 28 چوری میں 5 عورتوں کو ہراساں کرنے میں 19 دلتوں پر ظلم وزیادتی کے معاملے میں 25 اور سڑک حادثات میں مرنے والوں کی تعداد میں 19، فیصد کی کمی آئی ہے، یہ ایک اچھی شروعات ہے اور ہم اس اچھی شروعات کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

☆☆☆

احتساب

دینی مدارس اور مسلکی کشمکش: غور وفکر کے چند اہم پہلو

ڈاکٹر وارث مظہری
w.mazhari@gmail.com

دینی مدارس کو جن داخلی مسائل اور چیلنجوں کا سامنا ہے، ان میں ایک اہم مسئلہ مسلکی کشمکش کی وہ نامسعود فضا ہے جس کی دلدل میں مدارس کی اکثریت پھنسی ہوئی نظر آتی ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ ادھر چند سالوں میں مسلکی کشاکش کی اس فضا میں کمی آئی ہے۔ خدا کرے یہ حقیقت ہو لیکن یہ حقیقت ابھی دھندلکوں میں چھپی ہوئی ہے۔ مدارس سے شائع ہونے والے لٹریچر کا جائزہ لینے، طلبہ وفارغین مدارس کے ذہن کو پڑھنے اور پرکھنے سے جو حقیقت سامنے آتی ہے وہ اوپر بیان کردہ حقیقت کو مشتبہ کر دیتی ہے۔

مسلکی کشمکش کی تاریخ پرانی اور صدیوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن موجودہ عہد میں اس نے جو شکل اختیار کر لی ہے وہ صرف نظری مباحث اور ان کی مجالس تک ہی محدود نہیں ہے، اس نے مستقل حلقہ بندی اور گروہ پسندی کی صورت اختیار کر لی ہے، جس سے امت کا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا ہے اور اخوت اسلامی کی دھجیاں بکھر کر رہ گئی ہیں۔ امت مسلمہ کو درپیش چھوٹے بڑے چیلنجوں کا اس وقت تک صحیح طور پر اور مؤثر انداز میں جواب نہیں دیا جا سکتا جب تک اتحاد واخوت اسلامی کا وہ خواب جو امت کا ہر فرد دیکھ رہا ہے، نمایاں سطح پر شرمندۂ تعبیر نہ ہو جائے۔ لیکن مسلکی چپقلش کی یہ روش وہ پہلی اور بنیادی چیز ہے جو اس میں سب سے زیادہ حاوی ہے اور اس میں ہمارے مدارس ''سب سے اہم اور نمایاں رول'' ادا کر رہے ہیں۔

روایتی دینی مدارس (جس کی اکثریت ہے) کی تحریری وتقریری سرگرمیوں پر ایک سرسری نظر بھی اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ ان کا کم وبیش نوے فیصد حصہ مسلکی اکھاڑ پچھاڑ اور نظریاتی جنگ بازیوں پر مشتمل ہے۔ اللہ کے ''مخلص'' اور ''متدین'' بندوں پر مشتمل ایک بہت بڑی تعداد توپ اور گن سے لیس رات دن ''دشمنوں'' پر گھات لگائے بیٹھی ہے۔ یورش ویلغار کا کوئی ایک موقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا جاتا۔ اکثر جن مدرسوں سے ماہنامے، پندرہ روزہ یا سہ ماہی پرچے نکلتے ہیں، ان کی بقاوسلامتی جیسے اسی کشمکش کی فضا میں منحصر ہو کر رہ گئی ہے۔ بعض پرچے تو اس کار خیر کے لیے پورے طور پر خود کو وقف کر چکے ہیں۔

کتابیں اور کتابچے جس انداز میں لکھے جاتے ہیں اس کا اندازہ ان کے ناموں سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ ایک صاحب نے لکھا ''زلزلہ'' اس کا جواب دیا گیا ''دھماکہ'' یا زلزلہ درزلزلہ'' ایک صاحب قلم نے "یا لیت قومی یعلمون" لکھی تو اس کے جواب میں الیس منکم رجل رشید لکھی گئی۔ ایک حلقے کی طرف سے لکھا گیا ''مذہب حنفی کا پوسٹ مارٹم''۔ دوسرے حلقے کی طرف سے لکھا گیا ''غیر مقلدین کے مذہب پر تین طلاق'' وغیرہ۔

اس صورتحال کا سب سے خراب تر اور افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ہر جماعت اور مسلک کے حاملین کی طرف سے یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ہم حالت جنگ میں ہیں۔ ہمارے عقائد ونظریات اور اسلاف واکابر کی عظمت کو خطرہ لاحق ہے۔ اس لیے ہمیں ان کی حفاظت کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرنا چاہیے اور حالت جنگ میں ہونے کی وجہ سے ہمارے لیے سب کچھ جائز ہے۔

یہی وہ ذہنیت ہے جو اس روش کے اجتماعی نقصانات کو باور اور محسوس کرانے کے باوجود اس بات پر آمادہ نہیں کہ وہ اس سے دست کش ہو جائے، سوچنے کی بات یہ ہے کہ بالخصوص ہندوستان جیسے غیر مسلم اکثریت والے ملک میں جہاں انہیں اپنے وجود و بقا کی جنگ کا سامنا ہے، فرقہ پرست ہندو تنظیمیں خم ٹھونک کر ان کے خلاف عرصۂ دراز سے میدان میں ڈٹی ہوئی ہیں جن کا مطالبہ ہے کہ یا تو حکومت ان مدارس کو سرکاری تحویل میں لے لے یا پھر انہیں اسکولوں کی شکل دے دی جائے، آخر اس قسم کی طفلانہ سرگرمیوں کا کیا جواز رہ جاتا ہے؟ غور کرنے کی بات یہ بھی ہے کہ یہ تمام دینی مدارس عوامی چندوں کی بنیاد پر چل رہے ہیں۔ عوام کی اکثریت اس قسم کی تفریق ومنافرت کی سرگرمیوں کو پسند نہیں کرتی۔ اس کے پیش نظر صرف یہ بات ہوتی ہے کہ اس بے دینی اور مسلم مخالف ماحول میں نسل نو کی صحیح اسلامی خطوط پر تربیت وتعلیم ہو سکے۔ جو لوگ خلوص وللّٰہیت کے ساتھ اس کام میں جٹے ہیں، انہیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ مسلمان مرد وعورت میں خواندگی کی شرح اس ملک میں آزادی کے تقریباً ساٹھ سال گزر جانے کے باوجود کس قدر کم اور قابل افسوس ہے۔ ایسے میں ضرورت سب سے پہلے عوامی سرمایہ کو عوام کے اندر سے جہالت ونفرت کے خاتمے کی مہم پر صرف کرنے کی ہے۔ ایک شخص اگر جاہل یا محتاج ومفلس ہو تو اس کے لیے اس بات کا امکان کس قدر بڑھ جاتا ہے کہ وہ شیطانی بہکاوے میں آ کر سرے سے دین کو ہی خیر باد کہہ دے۔

اسباب ووجوہات:

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، مسلکی اختلاف وچپقلش کی روایت نئی نہیں ہے۔ نہ ہی یہ ہندوستان یا برصغیر ہند کی حد تک محدود ہے۔ تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ یہ کشمکش جس بھیانک شکل میں ہندو پاک میں دیکھنے میں آتی ہے کہیں اور دیکھنے میں نہیں آتی۔ نہ ہی ماقبل ادوار میں وہ کبھی اس افسوسناک شکل میں موجود رہی۔ اس سلسلے میں بعض واقعات کو کتابوں سے نقل ضرور کیا جاسکتا ہے لیکن ان کی حیثیت استثنائی ہے جب کہ آج اس نے ایک اجتماعی ظاہرے (phenomenonsocial) کی شکل اختیار کر لی ہے۔

اس سلسلے میں ہمیں یہ غور کرنا چاہیے کہ آخر اس کے اسباب کیا ہیں؟ یہ اس لیے ضروری ہے کہ اس کی واقفیت کے بغیر اسے نہ تو ختم کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی کم۔ میری نظر میں اس کی تین بنیادی وجوہ ہیں۔ (۱) نصاب تعلیم اور طریقۂ تدریس کی خامیاں۔ (۲) اندھی عقیدت اور شخصیت پرستی اور اس سے پیدا ہونے والی جذباتیت۔ (۳) حصول زر کا شوق یا مجبوری۔

نصاب تعلیم اور طریقۂ تدریس کی خامیوں اور کمیوں پر بہت کچھ لکھا جاچکا اور لکھا جارہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے یہاں جو دینی نصاب روبہ عمل ہے اور اسے جس طرح پڑھا جاتا ہے اس میں بجائے خود یہ نشانہ شامل ہوتا ہے کہ طلبہ کے ذہن کو آزاد چھوڑنے کی بجائے مخصوص فکر ومسلک کے سانچے میں ڈھال دیا جائے۔ تمام اہم بنیادی اسلامی علوم: حدیث، فقہ، تفسیر اور ان کے اصول ومتعلقات کو اسی زاویے اور نقطۂ نظر سے پڑھایا اور ذہن نشیں کرایا جاتا ہے، امتحان کے سوالات اسی پر مرکوز ہوتے ہیں اور لازماً طلبہ کو اپنے مطالعہ ومذاکرہ کا اکثر حصہ اسی میں لگانا پڑتا ہے، اس سے جو ذہنیت بن کر تیار ہوتی ہے اس پر حنفیت، شافعیت، مسلک اہل حدیث، دیوبندیت اور بریلویت کی چھاپ پہلے ہوتی ہے اور ایک باعمل مسلم عالم دین کی چھاپ بعد میں۔ جہاں تک دوسرے سبب کا تعلق ہے، دینی مدارس سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی اکثریت کا ذہن تعلیمی نصاب ونظام کے ایسے سانچے میں ڈھل کر تیار ہوتا ہے جس میں شخصیت پرستی بنیادی عنصر کے طور پر کام کرتی ہے۔ دینی احکام وشرائع اور افکار ونظریات کو بنیادی ماخذ سے مجرد شکل میں پڑھائے جانے کا رواج مدتوں پہلے ختم ہو چکا ہے۔ اب یہ ساری چیزیں متعین شخصیات کے حوالوں سے ہی پڑھائی جاتی ہیں، اب شخصیات کو حق تک رسائی کا صرف ذریعہ ہی نہیں سمجھا جاتا بلکہ معیار اور سرچشمہ سمجھا جانے لگا ہے۔ پہلے شخصیات کے حوالے سے حق کے اثبات کے لیے دلیلیں طلب کی جاتی تھیں لیکن اب شخصیات کے 'اثبات' کے لیے دلیلیں تلاش کی جاتی ہیں۔

ہر گروہ کے پاس کچھ مقدس شخصیات ہیں۔ ان شخصیات کے اقوال ونظریات ہیں۔ جن کا دفاع اسے ہر قیمت پر مطلوب ہوتا ہے حالانکہ مولانا مودودی کے بقول اگر اس حقیقت کو دل سے تسلیم کرلیا جاتا کہ کسی بھی شخصیت پر علمی تنقید سے اس شخصیت کی بے احترامی ہرگز نہیں ہوتی، ان کا احترام وتقدس اپنی جگہ اور ان کی نظر وفکر اور اقوال وآراء سے اختلاف اپنی جگہ۔ صرف صحابہ وتابعین ہی نہیں، اسلاف کی مثالوں کو سامنے رکھ کر دیکھئے کہ وہ اپنے بزرگوں، استاذوں سے کس قدر شدید اختلاف رکھتے تھے، لیکن اس سے کبھی ان کی بے احترامی لازم نہیں آتی تھی۔ اس کے جواب میں یہ بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ اب تنقید کا انداز بدل گیا ہے، اب اس میں تنقیص، عیب جوئی، کردار کشی، افترا پردازی اور لعن طعن بھی شامل ہوگیا ہے بلکہ اس سے بڑھ کر بسا اوقات دشنام طرازی اور تکفیر بازی تک سے گریز نہیں کیا جاتا، ایسے میں سنجیدہ سے سنجیدہ آدمی کے لیے بھی جذبات کو قابو میں رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ یہ بات اگرچہ صحیح ہے لیکن یہ اس شکل میں رد عمل کے جواز کے لیے کافی نہیں، جس کا مظاہرہ بالعموم کیا جاتا ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہوا کہ اگر کوئی اوباش اور گنوار آدمی بھدی اور غلیظ گالیاں آپ پر اچھالنے لگے تو آپ بھی ترکی بہ ترکی اس کے جواب پر مائل ہوجائیں۔ ایک شریف وصالح طرز فکر رکھنے والے آدمی کا طرز عمل ایسے معاملے میں وہی ہوتا ہے جس کی تعلیم قرآن میں دی گئی ہے۔ یعنی جب انہیں جہلاء مخاطب کرتے ہیں تو وہ دامن بچا کر آگے بڑھ جاتے ہیں: واذا خاطبهم الجاهلون قالو سلاما (الفرقان:٦٣)

تیسرا سبب سراسر معاشی ہے۔ دراصل ہر حلقے کی معتبر اور ترجمان شخصیات کو اس بات کی فکر لاحق ہوتی ہے کہ ان کے ارادت مندوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہے اور ان کے تعلق وعقیدت میں کوئی کمی یا فرق نہ آئے۔ اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ حلقہ بندی کی کیفیت میں زیادہ سے زیادہ شدت پیدا کی جائے کیوں کہ یہی شدت وعصبیت متعلقین ومعتقدین کو حلقے اور حلقے کی اہم شخصیات سے مضبوطی کے ساتھ باندھ کر رکھنے میں سب سے بنیادی کردار نبھاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر سیدھے سادھے عوام کو یہ باور کرادیا جائے یا وہ محسوس کرنے لگیں کہ ان کے 'درد' کی دوا دوسری جگہ بھی، مہنگے یا سستے داموں میں مل سکتی ہے تو وہ کسی ایک دکان کو ہی اپنا قبلۂ مقصود کیوں بنائیں؟

دوسری بات یہ ہے کہ مسلکی ونظریاتی جنگ وجدال پر مشتمل اس "عظیم وگراں" لٹریچر کو اگر دریا برد کردیا جائے یا اس کے فروخت پر پابندی عائد کردی جائے تو ان لکھنے، لکھوانے، شائع کرنے اور تقسیم کرنے والوں کی کیا بنے گی، جو دہائیوں سے اس کی روزی روٹی کھارہے ہیں؟ یہ معاملہ بھی ان شارحین اور شارحین کے ناشرین سے مختلف نہیں جو ایک (درسی) کتاب کی متعدد شرحوں کی موجودگی کے باوجود لفظوں کے الٹ پھیر سے اس کی شرح کرتے اور چھاپتے رہتے ہیں۔ یا وہ فضولی مصنفین جواز کارفتہ اور غیر ضروری موضوعات پر داد تحریر دیتے رہتے ہیں، بعض لوگوں کی آمدنی کا اضافی ذریعہ اسٹیج کی زینت بننا ہے تو بعض کا اوراق کی زینت بننا۔ اب روایتی مدارس کے فاضلین کی متوسط صلاحیت رکھنے والی اکثریت اگر لکھنے کا شوق کرے تو یا تو وہ شرح لکھ سکتی ہے یا تقریری کی کتاب یا مسلکی اختلافات پر مبنی چیزیں۔ چوتھا موضوع وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جن کا مقصد محض روپیہ کمانا یا اپنے حلقے میں شہرت ومقبولیت حاصل کرنا نہیں ہوتا۔

اس معاشی عامل سے اس پہلو کو بھی جوڑ کر دیکھنا چاہیے کہ ادھر دو تین دہائیوں میں خلیج عرب کی ریاستوں اور دوسرے ممالک سے حاصل ہونے والے چندوں کی دوڑ میں ہر چھوٹا بڑا دینی مدرسہ (بعض مستثنیات کے ساتھ) شامل نظر آتا ہے۔ بعض مسلک کے لوگوں نے خاص طور پر اپنے علم وفضل اور کوشش ومحنت کا بڑا سرمایہ اس بات میں صرف کیا اور کررہے ہیں کہ وہ چندے کے ماخذ، افراد اور اداروں کو اپنا گرویدہ بناسکیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود کو ان افراد اور اداروں کے مسلک ونظریات سے زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ اور قریب تر ثابت کریں اور اسی کے مثل دوسری جماعتوں کو ان نظریات سے بعید ومنحرف۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اب ان دوسری جماعتوں کے بھی بہت سے

لوگ اسی راہ کو منتخب کر کے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

حل کیا ہے؟

سوال یہ ہے کہ آخر اس مسئلے کا حل کیا ہے؟ اور اس پر کیوں کر قابو پایا جاسکتا ہے؟ میرے خیال میں اس کے لیے سب سے ضروری امر یہ ہے کہ اسلامی علوم خصوصاً فقہ وحدیث کی تدریس کے طریقے میں بنیادی سطح پر تبدیلیاں لائی جائیں، اس کے لیے وہی منہج اپنایا جائے جس کو بعض عرب اور اسلامی ممالک کی یونیورسٹیوں میں اپنایا گیا ہے۔ مثال کے طور پر فقہ کے حوالے سے شروع کے سالوں میں صرف احکام ومسائل کی تفہیم پر ہی ارتکاز ہونا چاہیے، دلائل اور استنباط کو آخری ایک دو سالوں کے لیے اٹھا رکھنا چاہیے تا کہ اس وقت تک طلبہ کے ذہن میں پختگی اور قوت اجتہاد وبصیرت پیدا ہو جائے۔ ہمارے یہاں فقہ کی تدریس میں سب سے زیادہ زور وجوہ ترجیح پر دیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں آخری حد تک یہ کوشش کی جاتی ہے کہ درس گاہ سے اٹھنے سے قبل طالب علم بہر صورت اس بات کو تسلیم کر لے کہ اس مسئلے میں بھی اس کے مذہب کا پلہ ہی تمام مذاہب پر بھاری ہے۔ استاد کی یہ کوشش نہیں ہونی چاہیے کہ طالب علم ہر حال میں اس کے مسلک ورجحان کا پابند ہو جائے بلکہ علمی بنیادوں پر اسے قبول کرنے یا رد کرنے کی مکمل آزادی ملنی چاہیے۔ وجوہ ترجیح پر بحث تخصص کی سطح پر ہونی چاہیے اور اس کے لیے فراغت کے بعد الگ سے گنجائش نکالی جانی چاہیے۔

حدیث کی تدریس سے متعلق بھی اس بات کو مد نظر رکھنا ضروری ہوگا کہ اسے کسی خاص مسلک اور مکتب فکر کے چوکھٹے میں ہی رکھ کر پڑھانے کی کوشش نہ کی جائے اس سے طلبہ کے اندر استنباط واجتہاد کی قوت پنپ نہیں پاتی۔ اس لیے ضروری ہے کہ حدیث کی تدریس اس ڈھنگ پر ہو کہ طلبہ کو خود سے اس کے اندر ڈوب کر منشائے رسالت کو معلوم کرنے کی جستجو ہو سکے اور وہ زیادہ وسیع افق میں کھلے ذہن کے ساتھ اپنی ذہنی ونظریاتی وابستگیوں کو حدیث رسول کے میزان پر پرکھ سکیں۔

طریق تدریس میں تبدیلی کے علاوہ خود نصاب کے اندر بھی بعض ایسے مضامین یا کتابوں کی گنجائش پیدا کی جاسکتی ہے جن کے ذریعہ مسالک ومکاتب فکر کے درمیان بڑھتی خلیج کو کم کرنے میں مدد مل سکے۔

مدارس، حلقہ اور مسلک کی بنیاد پر قائم ہیں۔ کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ ایک مسلک یا حلقے کا طالب علم دوسرے مسلک یا حلقے کے مدارس میں تعلیم کے لیے رخ کر پاتا ہو۔ اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ مخالف مسلک ومکتب فکر سے انتساب رکھنے والوں کے لیے سرے سے داخلہ کی گنجائش ہی نہیں رکھی گئی ہے یا پھر مدارس کی عمومی فضا یہ بن گئی یا بنادی گئی ہے کہ دوسرے حلقہ ومسلک کے طلبہ اپنے تئیں طنز وتعریض کے اس ماحول میں زبردست گھٹن اور حوصلہ شکنی محسوس کرتے ہیں۔ اگر ایک طرف مدارس کے دروازے کو تمام مکاتب فکر کے طلبہ کے لیے وا کر دیا جائے اور رواداری اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی عمومی فضا پیدا کرنے کی انتظامیہ کی طرف سے مخلصانہ کوششیں کی جائیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ موجودہ کھنچاؤ اور نفرت کی فضا میں کمی پیدا ہو۔ اس طرح مدارس کے انتظامیہ کے افراد میں بھی دوسرے مکاتب فکر کے لوگوں کو شامل کرنا چاہیے۔ مختلف تقریبات، سالانہ اجتماعات کے مواقع پر بھی انہیں اپنے یہاں بلانا چاہیے۔ طلبہ کی تحریری وتقریری سرگرمیوں پر نظر رکھی جانی چاہیے اور جہاں بات علم ومناقشے کی حد سے متجاوز نظر آئے، طلبہ کی اس پر سرزنش اور حوصلہ شکنی کی جانی چاہیے، کیوں کہ نظریاتی مباحث میں اگر سنجیدگی اور وقار نہ ہو تو ان کا نتیجہ ہمیشہ برعکس شکل میں سامنے آتا ہے۔

بہر حال مسلکی اتحاد کے متعلق اوپر جو معروضات پیش کی گئیں، ان کا مقصد دینی مدارس کی حیثیت کو کم یا مجروح کرنا نہیں، دین کے اس چشمۂ صافی میں در آنے والے اس گدلے پن کو دور اور صاف کرنا ہے تا کہ وہ امت مسلمہ اور عمومی طور پر پوری انسانیت کی آسودگی وسیرابی کا زیادہ بہتر سامان بن سکے۔

☆☆☆

راہ عمل

کریں کچھ کام ہم بھی کہ ابھی باقی ہے شباب اپنا

فیروز عالم ندوی
استاذ شعبہ عربی: یونیٹی پبلک اسکول چنئی، تمل ناڈو

ہماری پچھلی نسل جنہوں نے استعماری دور دیکھا ہے، ایک بڑا کارنامہ یہ انجام دیا کہ انہوں نے بڑی مشقتوں اور قربانیوں کے ذریعہ دولت ایمان کو ہم تک منتقل کر دیا ۔۱۸رہویں اور۱۹اویں صدیاں جو کہ برٹش استعمار کا دور تھا اس وقت نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں مسلمان سیاسی طور پر پوری طرح پسپا ہو چکے تھے ۔ مغرب کا یہ حملہ معلوم تاریخ کی سب سے خطرناک یلغار تھی ۔ دنیا نے اب تک صرف عسکری تخریب کاریوں کا ہی مشاہدہ کیا تھا، تہذیبی اور علمی یورش سے ناواقف تھی ۔اب جو حملہ ہوا اس کے پیچھے الحاد، مادیت، معاشرتی انارکی اور بے حیائی جیسے ہتھیاروں کا استعمال کیا جا رہا تھا، یہ سارے اسلحے علم کے خول میں بند تھے جو کسی بھی قوم کو بالکلیہ ہضم کرنے کے لئے کافی تھے۔ لشکر کشی قتل وغارت ایک حد پر جا کر ختم ہو جاتی ہے ،وہ کسی سے اس کا ایمان نہیں چھین سکتی۔ یہ علمی اسلحے جن کے اندر بہت ہی مہلک جراثیم تھے، لوگوں سے ان کا ایمان ،ان کی شناخت سب ختم کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور قوموں کو نگل جانے کے لئے بیتاب تھے ۔لیکن ہمارے اسلاف نے بڑی جانفشانیوں کے ذریعہ اس ''جوہر'' کو ہم تک پہو نچا دیا۔ یہ وہ کام تھا جو ان لوگوں نے کیا۔ اب جبکہ وطن کی آزادی کو ۷۰ سال گذر چکے ہیں، ملکی اور عالمی حالات میں بہت ساری تبدیلیاں آئیں ہیں ۔ہمیں ان تبدیلیوں کا جائزہ لے کر، موجودہ حالات کا صحیح تجزیہ کر کے میدان عمل اور طریقہ کار کا تعین کرنا چاہئے ۔مندرجہ ذیل سطور میں صورتحال کو ممکن حد تک واضح کرنے کے لئے مختلف زاویوں سے تصویر کشی کی گئی ہے۔

☆ ۱۷ویں صدی میں یورپ میں جو علمی انقلاب ہوا اس کا حریف چرچ تھا۔ اہل کنیسا نے علم وفکر اور حکومت وسیادت سب پر اجارہ داری قائم کر رکھی تھی۔ سارے شعبہ ہائے حیات ان کے ظلم سے جوجھ رہے تھے۔ لیکن فطرت نے جب مصنوعیت کے خلاف بغاوت کی تو ہر وہ چیز نشانہ پر آ گئی جس کا تعلق مذہب سے تھا اور اس طرح یہ جنگ علم بنام مذہب ہوگئی ،(اسلام دین فطرت ہے اس نے نہ علم پر پہرہ بٹھایا ہے اور نہ ہی اس کی حد پر واز مقرر کی ہے) لیکن مرور ایام کے ساتھ یہ حریفانہ مزاج کم ہوتا چلا گیا۔ اب وہ صورتحال نہیں ہے جو ان دو صدیوں میں تھی۔

☆ سلطنت مغلیہ کے سقوط کے ساتھ ہی مسلمان انتہائی نازک دور میں پہونچ گئے ۔ ناامیدی اور خوف و ہراس کے گھنے بادل نے انہیں ڈھانپ لیا۔ اس وقت علماء کرام کو مسلمانوں کے سب سے قیمتی اثاثہ کے حفاظت کی فکر لاحق ہوئی ۔ان لوگوں نے پورے ملک میں مدارس اسلامیہ اور مکاتب کے قیام کے لئے کمر کس لی ۔یہی وہ چیز تھی جس نے مسلمانوں کو ناپید اور مفقود الشناخت ہونے سے بچایا۔ دوسری جانب سر سید احمد رحمہ اللہ نے ایک تحریک چلائی جو اپنے آپ میں بہت موزوں، مناسب حال اور دوررس نتائج کی حامل تھی اور اس کا کافی اثر دیکھنے کو ملا۔

☆ ماقبل استعمار ہندوستان صدیوں مسلمانوں کے زیرنگیں رہا۔ مستعمرین نے اسے مسلمانوں سے چھینا تھا لہذا اس قوم کا سب سے زیادہ معتوب ہونا اور مشق ستم بننا بالکل فطری تھا ۔اس

صورتحال نے مسلمانوں کی فکری اور عملی قوت کو مجروح کیا۔اسی درمیان ہندو احیا پرستی کی تحریکیں اٹھیں جس کے نتیجہ میں متعدد تنظیمیں وجود میں آئیں۔ان میں سے زیادہ تر اپنے نظریات اور مقاصد کے تئیں متشدد اور انتہا پسند ہیں۔پھر جب آزادی کا وقت آیا تو بعض قائدین نے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر اس ملک کو مذہب کے نام پر بانٹ لیا۔ چونکہ یہ تقسیم سارے تاریخی، جغرافیائی اور زمینی حقائق کو نظر انداز کر کے کی گی تھی اسی لئے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اپنی اپنی مٹی سے چپکی رہ گئی اور ہجرت سے انکار کر دیا۔آج جبکہ آزادی کو سات دہائیاں گذر چکی ہیں مسلمانوں کی تعداد پھر اتنی ہوگئی ہے کہ وہ سیاسی امور میں براہ راست اثر انداز ہونے کے لئے کافی ہے۔یہ چیز برادران وطن پر بہت شاق گذرتی ہے اور وہ اس صورت حال سے بہت زیادہ نالاں رہتے ہیں۔اسی محرک نے آزادی سے لیکر اب تک سیکڑوں خونی فسادات کو جنم دیا۔اسی طرز فکر سے پیدا شدہ ایک سیاسی جماعت نے ۲۰۱۴ء کے پارلیمانی انتخاب میں واضح اکثریت حاصل کر لی اور پھر پے در پے کئی ریاستوں میں کامیابی کا پرچم لہرادیا۔ان کو روکنے کے لئے مسلم تنظیموں اور جماعتوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہوئیں۔

☆ پچھلی چند دہائیوں سے ملکی اور عالمی پیانہ پر مسلمانوں کی شبیہ کو خراب کرنے کا ایک نیا حربہ اختیار کیا جا رہا ہے۔انہیں سفاک، انتہا پسند، متشدد اور غیر مہذب ٹھہرانے کی ہر ممکن کوشش کی جارہی ہے۔پوری دنیا ان کے وجود کو باعث زحمت ثابت کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ ہمارے بعض نوجوان اپنے غیر دانشمندانہ اور عاجلانہ اقدام کے ذریعہ اس فکر کو غذا فراہم کرتے رہتے ہیں جو صورتحال کو بہت نازک بنائے ہوئے ہے۔

☆ ۱۹۲۳ء میں الغاء خلافت کے بعد دولت اسلامیہ چھوٹے چھوٹے حصوں میں بنٹ گئی۔ان میں چند ممالک ایسے ہیں جنھیں اللہ نے اتھاہ دولت سے نواز رکھا ہے۔یہ ممالک آپسی عدم اتحاد کی وجہ سے عالمی منظر نامہ پر کمزور شبیہ کے حامل ہیں جو کسی غیر مسلم ملک میں بس رہے مسلمانوں کو سیاسی فائدہ پہونچانے سے قاصر ہیں۔

☆ علوم وفنون میں غیروں کے ساتھ ہمارا تقابل پہاڑ اور ذرہ کا ہے۔ان چیزوں میں نمو کا تناسب خرگوش اور کچھوے کا ہے۔مگر اس کہانی میں خرگوش اپنی پوری طاقت کے ساتھ رواں دواں ہے اور کچھوا اپنی سست روی کے باوجود سویا ہوا ہے۔

☆ مسلمان مسلکوں کی بنیاد پر چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔اسی کو بنیاد بنا کر آپس میں عدم تعاون کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔کبھی معاملہ متشددانہ کاروائی تک پہونچ جاتا ہے۔افہام وتفہیم اور ایڈجیسٹمنٹ (Adjustment) کے طریقوں سے ناواقف ہیں۔

☆ آزادی کے بعد ملک کی معاشی حالت میں رفتہ رفتہ بہت سدھار ہوا۔مسلمان بھی اس کا ایک حصہ ہیں۔یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ یہاں مسلمانوں کی معاشی حالت بہت اچھی نہیں تو بہت خراب بھی نہیں ہے۔اس ملک کے طول وعرض میں چل رہے ہزاروں دینی مدارس جو کہ خود کفیل نہیں ہیں اور زیادہ تر یہیں کے باشندوں پر منحصر ہیں اس بات کا ثبوت ہیں۔اس سے ایک بات اور صاف ہو جاتی ہے کہ ان کے اندر کار خیر میں خرچ کرنے کا جذبہ قابل تعریف حد تک موجود ہے۔

☆ آزادی سے لیکر اب تک مسلمانوں نے سیاست میں کئی تجربات کئے لیکن یہ سب کسی خوش کن نتیجہ تک نہیں پہونچ پائے۔

یہ ایک تصویر کے مختلف زاویے اور ناچیے تھے جسے آپ نے پڑھا۔اب ان حالات کے پیش نظر وہ کون سے اقدامات ہیں جو دور رس نتائج کے حامل ہو سکتے ہیں۔وہ کون سی چیزیں ہیں جو ان حالات کے موافق ہو سکتی ہیں۔نیچے چند نکات کا ذکر کیا جارہا ہے۔ان کی مذکورہ بالا حالات سے موافقت اور تطبیق کو بیان کرنے میں کئی صفحات سیاہ ہو جائیں گے لہذا اسے قارئین پر چھوڑا جارہا ہے۔

❖ ملک کے تمام چھوٹے بڑے شہروں اور قصبات میں مسلمانوں کے اپنا پری پرائمری سے لے کر ہائیر درجات تک کے

اسکول ہونے چاہئیں ۔ اسی طرح سارے بڑے شہروں میں میڈیکل،انجینیر نگ ، بزنس اورآرٹ کالجز کی مو جودگی امر ناگزیر ہے۔UPSC،IITاور اس طرح کے دوسرے مقابلہ جاتی امتحانات کے لئے کوچنگ سینٹرز کا قیام انتہائی ضروری ہے۔ ان اداروں کے قیام کے لئے بڑی رقم کی ضرورت ہوگی لیکن مستقل خرچ کی نوبت نہ آئے گی۔انہیں پیشہ ورانہ طریقہ سے چلا نا ہوگا۔منافع کی بنیاد پر چلانا کوئی بری بات نہ ہوگی اس سے جہاں صاحب استطاعت طلبہ مستفید ہوسکیں گے وہیں کچھ نادار طلبہ کو بھی پڑھنے کا موقع مل جائے گا ،اور کچھ لوگوں کے لئے معاش کا راستہ کھل جائے گا۔اس خیال کو حقیقی شکل دینے کے لئے علمائے کرام کو آگے بڑھ کر صاحب ثروت لوگوں کو اس کام کے لئے آمادہ کرنا ہوگا ،عوام الناس کے درمیان تعلیم پر زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے کے لئے ذہن سازی کرنی ہوگی،انہیں یہ بات باور کرانی ہوگی کہ اس مقصد کو پورا کرنے کی خاطر اگر ہمیں روزمرہ کے معیار زندگی (Life Standard) میں نچلی سطح تک بھی جانا پڑے تو اس میں دریغ نہ کریں۔ساتھ ہی ساتھ علماء کو ان امور میں قائدانہ کردار قائم کئے رہنا ہوگا تا کہ ان اداروں کو اسلامی رنگ میں رنگ سکیں بصورت دیگر مقصد فوت ہوجائے گا۔

❁ ان اداروں کے قیام کا مقصد ایسے افراد کو تیار کرنا ہے جو ان علوم میں مقام اجتہاد تک پہونچ کر ان کے مذہب مخالف رنگ کو محو کردیں۔اسے اس دین کی ڈھال اور ہتھیار بنادیں۔ان علوم کے پیشہ ورانہ مزاج سے کلی اعراض درست قدم نہ ہوگا ،دونوں کے درمیان ایک متوازن صورت نکالنی ہوگی۔

❁ مدارس اسلامیہ کے نظام تعلیم وتربیت اور نصاب کے متعلق کسی معیار سے اطمینان اور ٹھہراؤ کا رویہ ترک کر کے ہمیشہ خوب سے خوب تر کے بارے میں فکر مند رہنا ہوگا۔اگر آپ قیادت کے دعوے دار ہیں تو پہلے آپ خود کو اس کی تمام صفات سے متصف کریں۔پھر یہ منصب خود آپ کے قدموں تلے آجائے گا۔علماء کی ایسی کھیپ تیار کریں جو بیدار مغز،انتہائی متحرک،نبض شناس،غیور اور علوم وفنون سے غیر روایتی طور پر آراستہ ہو۔

❁ جہاں تک ممکن ہو سکے علماء اور دانشوران اپنی تقریروں اور تحریروں میں سازشوں اور امتیازی سلوک کے تذکرہ سے گریز کریں۔یہ چیزیں صرف قنوطیت اور پژمردگی کا سبب ہوسکتی ہیں کسی نشأۃ کا نہیں۔ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگوں کو عملیت پسند بنایا جائے۔سارے امتیازی سلوک اور سازشوں سے قطع نظر جہد مسلسل کی دعوت دی جائے۔نامساعد حالات کا رونا رونا اپنی کاہلی اور بے عملی کی پردہ پوشی ہے۔حالات کا بننا اور بگڑنا اس دار فانی کی طبیعت ہے۔ان کے بننے اور بگڑنے کے ساتھ جذباتی ہو جانا فطرت انسانی کا ایک کمزور پہلو ہے۔ان کا سامنا کرنا اور حقائق سے آنکھیں ملانا ہی زندہ قوم کی علامت ہے۔

❁ دعوتی میدان میں الگ الگ محاذوں پر کام کررہی تنظیموں کو آپس میں تعاون کا رویہ اپنانا ہوگا یا کم ازکم عدم تنقیص کو راہ دینا ہوگا ،یہ وقت کا بہت اہم تقاضہ ہے۔اصل موضوع سے ہٹ کر غیر ضروری نکتہ چینی کرنے سے خود کی فعالیت متاثر ہوگی اور آپ اپنے متعین کی ہوئی راہ سے خود بھٹک جائیں گے۔اس خیال کو حقیقت میں بدلنے کے لیے ان لوگوں کو سامنے آنا ہوگا جنکی علمی دنیا میں ایک پہچان ہو ۔ان لوگوں کو ان تنظیموں کے سرکردہ حضرات کی توجہ اس جانب مبذول کرانی ہوگی اور ان کے درمیان اس موضوع پر گفت وشنید کا سلسلہ شروع کرانا ہوگا۔

❁ ایسی تنظیمیں جو مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی نگرانی کیلئے بنائی گئی ہیں ، جنہوں نے ایک لمبے عرصے سے بہت ساری خدمات انجام دی ہیں انھیں اپنے سفر کو ہمیشہ فعال سے فعال تر کی طرف جاری رکھنا ہوگا۔ان کے ساتھ ہر عام وخاص کو بھر پور تعاون کرنا ہوگا۔ورنہ نئی نئی تنظیموں کو معرض وجود میں لانا صرف اور صرف چودھراہٹ کی بھوک کو مٹانے کے ہم معنی ہے۔اس قسم کے لوگوں سے مکمل اعراض کا رویہ اپنانا ہی زیادہ بہتر ہے۔

❁ ایک ایسے دعوتی کام کی ابتداء کی جانی چاہئے جس میں بہت زیادہ عموم ہو۔۔ایسی برائیاں جو بحیثیت معاشرہ تمام مذاہب کے

لوگوں میں مشترک ہیں، مثلاً: بدعنوانی، جرائم، نشہ اور جہیز وغیرہ، ان خرابیوں سے لڑنے کے لئے ایک ایسی تنظیم ترتیب دی جائے جس میں علماء اسلام کی قیادت میں تمام ادیان کے پیشواؤں کو شامل کیا جائے اور بلاامتیاز مذہب ہر ایک تک پہونچا جائے۔ کسی مذہب کا نام لئے بغیر برائیوں کے خلاف آواز اٹھائی جائے۔ لیکن اس کے پیچھے اسلام کی روح موجود ہو۔ اگر اس طرح کا کوئی کام بڑے پیمانہ پر شروع کیا جائے تو اس سے بیک وقت کئی فوائد کا حصول ممکن ہوسکتا ہے، جیسے: مذہبی منافرت کی فضا کم ہوگی جو کہ طالب اقتدار لوگوں کا ایک بہت بڑا ہتھکنڈہ ہے، بالواسطہ اور غیر محسوس طریقہ سے اسلام کو دوسروں تک پہونچانے کے لئے ایک پلیٹ فارم ملے گا، اسلام کی شبیہ کو خراب کرنے کی جو کوشش کی جارہی ہے اس کے ازالہ کا ایک ذریعہ ہوسکتا ہے اور سب سے بڑھ کر بحیثیت امت محمدیہ ہمیں اپنی افادیت ومقصد وجود ثابت کرنے کا موقع ملے گا۔

﴿۶﴾ اختلاف انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ اسی لئے اسلامی علوم وفنون میں اختلافات کا سلسلہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانہ سے ہی شروع ہوگیا۔ اس کی اصل جگہ مدارس وجامعات ہیں، یہاں ان پر بحث مباحثہ کے ذریعہ علوم وفنون میں ترقی ہوتی ہے، اگر ان کو بازارں اور اسٹیجوں میں اچھالا جائے تو غلط شکل اختیار کر لیتے ہے جو معاشرہ کے لئے مضر اور خطرناک ہے۔ اس کو ختم کرنے کے لئے کوئی مناسب قدم اٹھانا ہوگا۔ ایسے کسی کام کی ابتداء دور میعادی بنیاد (Long Term Planning) پر کی جانی چاہئے۔ قلیل مدت میں اس کا حصول ناممکن ہے۔ اختلافات خواہ علمی بنیاد پر ہوں یا غیر علمی بنیاد پر ان کے خاتمہ کا خواب دیکھنا ہوا میں درخت اگانے کے مانند ہوگا، لہذا ایک ایسی فضا کو ہموار کیا جائے جس میں ہر شخص اپنی صواب دید کے مطابق متعلقہ مسلک پر عمل کرتے ہوئے دوسروں کو برا بھلا کہنے سے گریز کرے۔ یہ کام بہت ہی چیلینجنگ (Challenging) ہے کیونکہ ہر مکتب فکر میں کچھ ایسے افراد موجود ہیں جن کے لئے مسلک کارگاہ تجارت اور اختلافی مسائل سامان تجارت کی حیثیت رکھے ہیں۔ ان کی دکانوں کو بند کرنا کوئی آسان کام نہ ہوگا۔ اگر دور بینی، فراست ایمانی اور حکمت کے ساتھ کوئی لائحہ عمل تیار کیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ مذکورہ بالا مقصد کو حاصل کر لیا جائے۔ اس سے افہام وتفہیم اور تبلیغ کے لئے مناسب فضا دستیاب ہوگی۔

﴿۷﴾ انفارمیشن ٹکنالوجی کی ترقی نے دنیا کو ایک گاؤں میں بدل کر رکھ دیا ہے۔ کرہ ارض کے ایک کونہ میں ہونے والے کسی حادثہ کی خبر صرف چند منٹوں میں دوسرے سرے تک پہونچ جاتی ہے۔ اس ہتھیار کو دشمنان اسلام نے خوب اچھی طرح استعمال کیا۔ اس میدان میں ہماری عدم موجودگی کی وجہ سے عملی اقدام تو دور کی بات ٹھہری ہم اپنا دفع تک نہ کر سکے اور انہوں نے جس طرح چاہا اس دین اور اس کے ماننے والوں کو بدنام کیا۔ ہم صرف سازشوں اور بے چارگیوں کا رونا روتے رہے۔ یہ رونا گانا اس مسئلہ کا حل نہیں ہے بلکہ اس میدان میں اترنا ہوگا۔ اس کام میں بہت سارے داخلی اور خارجی چیلنجیز ہیں لیکن ان کا سامنا کرنا وقت کی ضرورت ہے، اس سے چشم پوشی اور فرار کی قطعی گنجائش نہیں۔ انتھک غور وفکر اور جہد مسلسل کے ذریعہ ساری مشکلات اور پیچیدگیوں کا حل نکل آتا ہے، دیر صرف عملی اقدام کی ہے۔

یہ وہ چند کام ہیں جو راقم الحرف کے ناقص علم ورائے کے مطابق موجودہ وقت میں کئے جانے کے لائق ہیں۔ ممکن ہے حالات کی تصویر کشی اور ان کے مناسب عمل کی تعین میں کمی رہ گئی ہو۔ بہر حال یہ وقت عملی اقدام کا ہے تا کہ ہم اپنی آنے والی نسل کو ایمان ویقین کے ساتھ ایک مستحکم پوزیشن دے سکیں۔ اگر اس طرح کے کسی منصوبہ کو عملی جامہ پہنا سکیں یا کچھ کام منصوبہ بند طریقہ سے کر سکیں تو بجا طور پر ہم بھی یہ کہتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہونگے کہ ؎

کئے تھے ہم نے بھی کچھ کام جو کچھ ہم سے بن آئے
یہ قصہ جب کا ہے باقی تھا جب عہد شباب اپنا

☆☆☆

تاریخ کے جھروکوں سے

اسلامی نشأۃ ثانیہ میں حضرت شیخ الہندؒ کی دینی اور علمی خدمات

محمد خالد ضیاء صدیقی ندوی

ہندوستان کی تاریخ پر جن کی نظر ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ ملک ''عظیم شخصیات'' کو جنم دینے میں کبھی بخیل نہیں رہا، ہر دور میں اس کی کوکھ سے ایسی عظیم شخصیات جنم لیتی رہی ہیں جو ہمیشہ قوموں اور ملکوں کی عزت کا تاج ہوا کرتی ہیں، جن کا وجود قوم وملت کے لئے باعث سعادت و برکت اور ملک و وطن کے لئے باعث افتخار ہوا کرتا ہے، ایسی ہی بلند اور یگانہ شخصیتوں میں ایک حضرت شیخ الہندؒ کی ذات گرامی بھی ہے جو صدیوں کے بعد معدن انسانیت سے نکلا کرتی ہیں بقول شاعر

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

کسی بھی شخصیت کے مقام اور کام کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے یہ بہت ضروری ہوتا ہے کہ اس کے عہد کے سیاسی دینی، معاشرتی حالات کا جائزہ لیا جائے، کیوں کہ انسان کے خیالات، افکار ونظریات اور کارناموں میں جس طرح گھریلو ماحول کی پرچھائیاں ہوتی ہیں اسی طرح گردوپیش کے ماحول کے اثرات بھی نمایاں طور پر نظر آتے ہیں، حضرت شیخ الہندؒ کو جو عہد ملا وہ مختلف حیثیتوں سے بڑی اہمیت رکھتا ہے اور ساتھ ہی زوال و اضمحلال کی کیفیت سے دوچار بھی، اس لئے انتہائی اختصار کے ساتھ اس عہد کا مختصر سا خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کا عہد:

آپ نے جس عہد میں آنکھیں کھولیں وہ تیرہویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی کا دور ہے جو صحیح معنوں میں پوری اسلامی دنیا کے سیاسی، دینی، فکری، معاشرتی اور اخلاقی زوال کی صدی ہے، بقول حضرت مولانا علی میاں ندویؒ:

''اسی صدی میں عالم اسلام کے نہایت اہم زرخیز ومردم خیز ملک مغربی اقوام کے غلام بنے، ہر جگہ اسلامی تہذیب اور اسلامی علوم کو موت وزیست کی کشمکش سے سابقہ پڑا، عالم اسلام میں نئے نئے دینی فتنے، گمراہ کن تحریکیں، یہاں تک کہ مدعی نبوت تک پیدا ہوئے، عیسائی مبلغین نئے جوش وخروش کے ساتھ میدان میں آئے، نئے نظام تعلیم نے جو خالص مادی بنیادوں پر قائم تھا سارے اسلامی ممالک پر اپنا سایہ پھیلایا''(۱)

ہمارا ملک ہندوستان بھی ہر طرح کے زوال اور اضمحلال کا شکار تھا، مجموعی اعتبار سے یوں کہیئے کہ جانکنی کے عالم میں تھا اور اس کی حثیت ''چراغ سحر'' سے زیادہ نہ تھی، اور کیوں نہ ہوتا جبکہ ''یہاں سلطنت مغلیہ اور درحقیقت مسلمانوں کے آخری سیاسی اقتدار کا چراغ بھی گل ہوا تھا، اور اس پر براہ راست انگریزی تسلط قائم ہوا تھا، اور اس پر براہ راست انگریزی تسلط قائم ہوا تھا جو مسلمانوں کی آخری قوتِ مقابلہ کا زخم کھا کر مسلمانوں کے لئے ہمدردی اور رواداری بلکہ حاکمانہ عدل وانصاف اور مساویانہ سلوک کے جذبات سے بھی خالی اور جذبۂ انتقام سے بھرپور تھا، یہ سخت اضطراب و انتشار تحیر وسرگشتگی، تذبذب وتردد اور کسمپرسی کا دور تھا''(۲)

جہاں تک تعلق ہے دینی اور معاشرتی زوال کا، تو اس سلسلے

میں اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ ''دلی مرحوم'' کے اجڑ جانے کے بعد ہر طرح شرک و بدعت کا بازار گرام ہو چکا تھا، ''اس وقت ہندوستان میں قدیم مدارس قریب قریب ختم ہو چکے تھے، اور کہیں کہیں جو دو چار باقی بھی رہ گئے تھے ان کی حالت کرک شب تاب سے زیادہ نہ تھی'' (۳)

الغرض یہ کہ۔

جدھر جاتی تھیں نظریں، تذکرے تھے شرک و بدعت کے
فناسب ہو چکے تھے، مدرسے درس شریعت کے
پتہ باقی نہ تھا، اسلاف کی بے مثل شوکت کا
زمانہ ہو چکا تھا ختم، اسلامی حکومت کا

''ایسی حالت میں اگر ہندوستان عظیم ومنفرد شخصیتوں سے خالی اور یہاں قحط الرجال کا دور دورہ ہوتا تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی، مگر اس کے برعکس یہ دور اکابر رجال و مردان کار کی حیثیت سے بھی، ماہرین فنون، اہل تصنیف واصحاب فکر کے لحاظ سے بھی، اہل قلوب واصحاب باطن کے نقطۂ نظر سے بھی، اور تعلیمی واصلاحی تحریکوں کے اعتبار سے بھی، اور اس حیثیت سے بھی کہ اس دور میں بعض عظیم ترین تعلیمی مرکز اور ادارے (جو صرف درسگاہیں نہیں بلکہ مدارس فکر اور مستقل دبستاں ہیں) قائم ہوئے، سارے عالم اسلام میں خصوصی امتیاز رکھتا ہے'' (۴)

خاندان اور مردم خیز وطن:

حضرت شیخ الہندؒ کا وطن وہی دیوبند ہے جو اپنی قدامت کے باوجود آج سے کوئی ڈیڑھ صدی پہلے ہندوستان کے نقشے میں ایک نقطے کی حیثیت بھی نہیں رکھتا تھا، لیکن ۳۰؍مئی ۱۸۶۷ء یوم پنجشنبہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا وہ مبارک ومسعود دن ہے جس نے اس گمنام بستی کو وہ شہرت دوام بخش دی اور پھر اس بستی سے امت ہندیہ کو ایسی قدر آور ہستیاں ملیں جن کی روشنی سے پورا عالم منور ہوا، دیکھنے میں یہ ایک چھوٹی سی بستی ہے مگر بقول جناب مولانا نسیم اختر شاہ قیصر صاحب، خدائی فضل وکرم کے لا تعداد آثار اور بے شمار نشانیاں یہاں آپ کو نظر آئیں گی، علم وعمل کے وہ گراں، رشد وہدایت کے روشن مینار، فکر وفن کے ہزار ہا قندیلیں اور اخلاق وشائستگی کے چھوٹے بڑے چراغ آپ کو یہاں روشن ملیں گے'' (۵)

یہی وہ مردم خیز بستی ہے جسے حضرت شیخ الہند کے وطن ہونے کا شرف حاصل ہے، ایک عرصۂ دراز سے اس بستی میں عثمانی، صدیقی اور سادات خاندان کے شیوخ آباد ہیں، صدیقی شیوخ کا سلسلہ دیوبند میں شیخ معزالاسلام سے چلا ہے جو ساتویں صدی کے اواخر کے ہیں، جبکہ عثمانی شیوخ ابوالوفاءؒ کی اولاد میں ہیں جو آٹھویں صدی ہجری میں دیوبند آ کر مقیم ہو گئے تھے، گیارہویں صدی ہجری کے اوائل میں دیوبند میں سادات کے ایک خاندان کا اضافہ ہوا، اس خاندان کے مورث اعلیٰ کا نام سید محمد ابراہیم تھا۔ دیوبند میں علم کی اولین شعاع آپ ہی کے مبارک ہاتھوں نے روشن کیا تھا، دیوبند کی تاریخ میں اس سے قبل علم کی روشنی کا سراغ نہیں ملتا۔

حضرت شیخ الہندؒ عثمانی خاندان کے گلشن کے گل سرسبد ہیں، اس خاندان کے ایک بزرگ شیخ فتح علی تھے ان کے تین صاحبزادوں میں دو صاحبزادوں نے دیوبند کی علمی شخصیتوں میں بلند مقام حاصل کیا، ان کے بڑے صاحبزادے مولانا مہتاب علی صاحب تھے، دوسرے مولانا ذوالفقار علی تھے جو حضرت شیخ الہند کے والد ماجد تھے (۶)

آپ کے بڑے ابا حضرت مولانا مہتاب علی صاحبؒ تیرہویں صدی ہجری کے اوائل میں دیوبند کے خاص استادوں میں تھے، دیوبند کے رئیس شیخ کرامت حسین کے دیوان خانہ میں جو مدرسہ قائم تھا اس میں عربی پڑھاتے تھے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی عربی تعلیم کا آغاز اسی مدرسہ سے ہوا تھا، قیام دارالعلوم کے لئے پہلا چندہ حاجی محمد عابدؒ کا تھا اور دوسرا چندہ انہی مولانا مہتاب علیؒ نے دیا تھا، قیام دارالعلوم کے بعد اس کی مجلس شوری کے رکن قرار پائے، آپ کی وفات ۱۸۷۶ء میں ہوئی۔ (۷)

آپ کے والد ماجد حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب ایک نہایت ہی صاحب اقبال اور دینی دنیاوی حیثیتوں سے صاحب

وجاہت وعزت عالم تھے، باوجود کرم اخلاق کے صورت سے سیادت اور رعب عیاں تھا،حق تعالیٰ نے اموال واولاد اور صحت و عافیت سے بہرۂ وافی عطا فرمایا تھا اور مولانا اپنے شہر میں نہایت خوش قسمت اور بلند اقبال شمار ہوتے تھے(۸)

مولانا ذوالفقار علیؒ کا شمار وقت کے قدآور علماء میں تھا، آپ حضرت مولانا مملوک علی نانوتویؒ کے شاگردوں میں تھے، عربی زبان وادب پر آپ کو غیر معمولی قدرت حاصل تھی، آپ دیوان حماسہ دیوان متنبّی اور سبعہ معلقہ کے بہترین اور کامیاب شارح بھی ہیں، عربی نثر ونظم دونوں پر آپ کو یکساں قدرت تھی، آپ ایک مدت تک بریلی کالج میں پروفیسر بھی رہے اور محکمہ تعلیم میں ڈپٹی انسپکٹر بھی، آپ کی تمام عمر علمی خدمات میں بسر ہوئیں، چالیس سال تک دارالعلوم کی مجلس شوری کے باوقار رکن رہے ۱۹۰۴ء میں آپ کا انتقال ہوا، حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کے پہلو میں محوخواب ہیں۔

ولادت سے تکمیل علوم تک:

حضرت شیخ الہندؒ ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء میں بمقام بریلی (جب کہ آپ کے والد ماجد بوجہ ملازمت مع اہل وعیال وہاں مقیم تھے) عالم ظہور میں تشریف لائے، والد ماجد نے بطرز شائستہ اظہار مسرت کیا اور محمود حسن نام رکھا، ۶رسال کی عمر میں پڑھنے بٹھائے گئے، قرآن مجید کا اکثر حصہ میاں جی منگلوری سے پڑھا، بقیہ قرآن پاک اور فارسی کی ابتدائی کتابیں میاں جی مولوی عبداللطیف صاحب سے پڑھیں، اس کے بعد فارسی کی سب کتابیں اور ابتدائی کتب عربی اپنے معزز چچا اور مشہور استاد مولانا مہتاب علیؒ سے پڑھیں۔(۹)

آپ کی عمر ۱۵رسال کی تھی، اور آپ قدوری اور شرح تہذیب وغیرہ پڑھ رہے تھے کہ دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا اور اس طرح آپ دارالعلوم کے پہلے طالب علم ہوئے اور ''ملا محمود'' پہلے استاذ آپ نے ملا محمود سے میبذی اور کنز الدقائق وغیرہ پڑھی اور حدیث وفقہ کی کتابیں مولانا یعقوب نانوتویؒ اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے پڑھیں۔ ''تکمیل علوم کے بعد حضرت نانوتویؒ کی خدمت میں رہ کر علم حدیث کی تحصیل فرمائی، فنون کی بعض اعلی کتابیں والد ماجد سے پڑھیں، ۱۸۷۴ء میں حضرت نانوتویؒ کے دست مبارک سے دستار فضیلت حاصل کی''(۱۰)

حضرت نانوتویؒ سے آپ کو بڑی قربت تھی، حضرت بھی خصوصی شفقت سے پیش آتے تھے کہ مستقبل میں آپ کو حضرت کا وارث وامین اور سچا جانشین بننا تھا، حضرت مولانا سید محمد میاں صاحبؒ لکھتے ہیں:

''ابتدا ہی سے آپ کو (حضرت شیخ الہندؒ) حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے سپرد کر دیا گیا تھا یعنی کامل آفتاب کی خدمت میں ایسا باکمال آئینہ پیش کر دیا گیا تھا جس نے نہ صرف نور آفتاب کو سمیٹا، بلکہ اس کی تمام حرارتوں کو بھی اپنے اندر سمولیا۔۔۔۔۔یہی وہ محمود ہے جن کے استاذ بھی محمود تھے اور جن کی وجہ سے مدرسہ بھی محمود ہوا، اس باکمال آئینہ نے اولا حجۃ الاسلام کے منبع فیوض سے سینہ کو معمور کیا اور پھر دربار رشیدی کا بہترین ہیرا بن کر جملہ خصوصیات کا حامل بنا، اور اس طرح قاسمی اور رشیدی آفتابوں کا ماہ کامل بن کر عالم میں چمکا''(۱۱)

مسند تدریس سے منصب صدارت تک:

حضرت شیخ الہندؒ نے اپنی پختہ علمی استعداد اور اعلیٰ علمی اور ذہنی صلاحیتوں کے باعث اپنی تعلیم کے آخری دو سالوں ہی میں فرصت کے اوقات میں تعلیم وتدریس کا سلسلہ اعزازی طور پر شروع کر دیا تھا، چنانچہ اس زمانہ میں بڑی بڑی کتابیں آپ طلبہ کو پڑھایا کرتے تھے اور طلبہ کا رجوع بھی روز بروز بڑھتا ہی جارہا تھا، لیکن باتنخواہ پڑھانے کو پسند نہیں فرماتے تھے اور خود آپ کے والد ماجد حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ بھی اس بات پر راضی نہ تھے کہ آپ ایک دینی مدرسہ میں تنخواہ لے کر مدرسی کریں، لیکن جب دارالعلوم کے ارباب حل وعقد نے آپ کی صلاحیتوں کے پیش نظر آپ کو مدرس رکھنے پر اصرار کیا جن میں سرفہرست دارالعلوم کے مہتمم حضرت مولانا رفیع الدین صاحب تھے تو آپ کے والد ماجد نے ان بزرگوں کی مرضی پر چھوڑ دیا، اس طرح ۱۸۷۵ء میں مدرس چہارم کی حیثیت سے باقاعدہ آپ کا تقرر عمل

میں آیا، بتدریج ترقی فرما کر مولانا سعید احمد دہلوی کے مستعفی ہوجانے کے بعد ۱۸۹۱ء میں صدارت کے منصب پر پہنچے۔

تدریسی خدمات:

حضرت شیخ الہندؒ کی زندگی کا مطالعہ بتلاتا ہے کہ دست قدرت سے آپ کو علم وکمال کی بڑی ارزانی ہوئی تھی، چنانچہ آپ کی جلالت علمی، اور مختلف علوم وفنون پر گہری نظر کے پیش نظر آپ کے تلامذہ آپ کو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، بلکہ آپ کے اساتذہ اور شیوخ آپ پر بڑا اعتماد کرتے تھے، اور آپ کے کمال علم وفن کے قائل تھے۔

آپ نے اسلامی علوم وفنون کی اشاعت میں عمر کا ایک بڑا حصہ صرف کیا، اور وہ بھی دارالعلوم دیوبند کی چہار دیواری میں رہ کر، لیکن اس کے باوجود ملک اور عالم اسلام کے حالات سے خوب باخبر رہتے اس طرح آپ کی شخصیت وسعت مطالعہ اور زمانہ کی نبض شناسی کے باعث ایک باوقار، دلآویز اور جامع شخصیت بن گئی تھی جس کا اظہار درس میں موقع بہ موقع خوب ہوتا تھا۔

آپ کی تدریسی خدمات کا آغاز (جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے) دارالعلوم ہی سے ہوا تھا اور روز اول ہی سے طلبہ اور علماء کا رجوع آپ کی طرف بڑھنے لگا تھا، لیکن آپ کی شہرت وعظمت کا چرچہ اس وقت زیادہ ہو گیا جب آپ نے منصب صدارت کو زینت بخشی اور شیخ الحدیث کے منصب جلیل پر فائز ہوئے، آپ کے دور صدارت میں دورۂ حدیث کے طلبہ کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا، بلکہ بیرون ملک کے طلبہ بھی آپ کے درس حدیث کی خصوصیات وامتیازات کا شہرہ سن کر پروانہ وار ٹوٹ پڑے اور اپنے اپنے ظرف واستعداد کے مطابق دامن مراد کو علمی خزانوں سے بھر کر لوٹے۔

آپ کا انداز درس بالکل حضرت نانوتویؒ کے درسی امتیازات وخصوصیات کا حامل تھا، گویا آئینہ نے سورج کی روشنی اور اس کی آب وتاب کو اپنے اندر سمو لیا تھا، آپ کے طریق تدریس کی تفصیل حضرت مولانا شاہ اصغر حسین میاںؒ کے قلم سے ذیل میں پیش کی جاتی ہے جن کا شمار حضرت شیخ الہندؒ کے ممتاز تلامذہ میں تھا، انہوں نے بڑی خوبی اور سلیقے سے درس کے مختلف گوشوں پر کامیابی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، چنانچہ موصوف لکھتے ہیں:

''حلقۂ درس کو دیکھ کر سلف صالحین واکابر محدثین کے حلقۂ حدیث کا نقشہ نگاہوں میں پھر جاتا تھا، قرآن وحدیث حضرت کی زبان پر تھا اور ائمۂ اربعہ کے مذاہب ازبر، صحابہ وتابعین، فقہا اور مجتہدین کے اقوال محفوظ، تقریر میں نہ گردن کی رگیں پھولتیں تھیں منہ میں کف آتا تھا، نہ مغلق الفاظ سے تقریر کو جامع الغموض اور بھدی بناتے تھے، نہایت سبک اور سہل الفاظ با محاورہ اردو میں اس روانی اور جوش سے تقریر فرماتے کہ معلوم ہوتا کہ دریا امڈ رہا ہے، یہ کچھ مبالغہ نہیں ہے، ہزاروں دیکھنے والے موجود ہیں کہ وہی منحنی اور منکسر المزاج ایک مشت استخواں، ضعیف الجثہ مرد خدا جو نماز کی صفوں میں ایک معمولی مسکین طالب علم معلوم ہوتا تھا مسند درس پر تقریر کے وقت یوں معلوم ہوتا تھا کہ ایک شیر خدا ہے جو قوت وشوکت کے ساتھ حق کا اعلان کر رہا ہے، آواز میں کرختگی آمیز بلندی نہ تھی لیکن مدرسے کے دروازے تک بے تکلف قابل فہم آواز آتی تھی، لہجے میں تصنع اور بناوٹ کا نام نہ تھا لیکن خدا تعالیٰ نے تقریر میں اثر دیا تھا، بات دلنشیں ہوجاتی تھی اور سننے والا بھی یہ سمجھ کر اٹھتا تھا کہ جو وہ فرما رہے ہیں وہ حق ہے۔

بہت سے ذی استعداد اور ذہین وفطین طالب علم جو مختلف اساتذہ سے استفادہ کرنے کے بعد حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے، اپنے شکوک وشبہات کے کافی جواب پانے کے بعد حضرت مولانا کی زبان سے آیات قرآنی اور احادیث نبویہ کے معانی اور مضامین عالیہ سن کر سر نیاز خم کر کے معترف ہوتے کہ یہ علم کسی کو نہیں ہے اور ایسا محقق عالم دنیا میں نہیں ہے۔

مسائل مختلف فیہا میں ائمۂ ثلاثہ رحمہم اللہ بلکہ دیگر مجتہدین کے مذاہب بھی بیان فرماتے اور مختصر طور سے دلائل نقل کرتے، لیکن جب امام ابوحنیفہؒ کا نمبر آتا تو مولانا کے قلب میں انشراح، چہرے پر بشاشت، تقریر میں روانی لہجے میں جوش پیدا ہوجاتا تھا، دلیل پر دلیل، شاہد پر شاہد، قرینہ پر قرینہ بیان کرتے چلے جاتے، تقریر رکتی ہی نہیں تھی، اور اس خوبی سے مذہب امام اعظم کو ترجیح دیتے

تھے کہ سلیم الطبع اور منصف مزاج لوٹ جاتے تھے، دور کی مختلف المضامین احادیث جن کی طرف سے کبھی خیال بھی نہ جاتا تھا پیش کر کے اس طرح مدعا ثابت فرماتے کہ بات دل میں اترتی چلی جاتی تھی، اور سامعین کا دل گواہی دیتا اور آنکھوں سے نظر آجاتا تھا کہ یہی جانب حق ہے، بہ این ہمہ ائمۂ اسلام کا ادب واحترام اور ان کے کمالات کا اعتراف حضرت کی تعلیم کا ایک جزء لاینفک تھا، خود بھی ایسی ہی تقریر فرماتے اور صراحت سے ذہن نشین کراتے کہ مذاہب مجتہدین حق ہیں، وہ سب متدل بالکتاب والسنۃ، ان کی تنقیص موجب بدبختی اور سوء ادب باعث خسران ہے'' (۱۲)

حضرت شیخ الہندؒ کے درس کی ایک اہم خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جناب مولانا اسیر دروی صاحب ارقام فرماتے ہیں:

''شیخ الہندؒ کے درس کی یہ بھی ایک اہم خصوصیت تھی کہ دوران درس کوئی زائد بات طلبہ سے بے تکلفی کی گفتگو، قصہ اور حکایات، نشاط طبع کے لئے کوئی لطیفہ ہرگز بیان نہ فرماتے، ہنسی اور تفریح کے لئے بھی کوئی جملہ زبان سے نہیں نکالتے، حلقۂ درس اس طرح پروقار مرعوب کن، خاموش اور ہر طرح کی حرکات وسکنات سے خالی ہوتا تھا جیسے عدالت کی کرسی پر چیف جسٹس کی موجودگی میں ہوتا ہے، کسی بھی ناشائستہ حرکت کا یہاں تصور بھی نہیں ہوتا، استاذ اور طلبہ اس طرح پر سکون، مؤدب اور پروقار رہتے جیسے کسی تحقیقی ادارے میں ریسرچ اور تحقیق کا نازک ترین اور اہم کام ہو رہا ہے'' (۱۳)

علمی کارنامے:

حضرت شیخ الہندؒ کی زندگی باوجودیکہ انتہائی مصروف اور مختلف قسم کی ذمہ داریوں سے مشغول رہی، اور کوئی لمحہ ایسا نہ گزرا جو بے مقصدیت اور غفلت کی نذر ہوا ہو، لیکن اس قدر مشغول اور مصروف ترین زندگی میں بھی آپ نے چند ایسے علمی کارنامے انجام دئے جو توفیق الٰہی کے بغیر ممکن نہیں، آپ کی تصانیف آپ کے علم وعمل اور فضل وکمال کی آئینہ دار اور آپ کی شان عبقریت کو نمایاں کرنے والی ہیں، ذیل میں آپ کی چند کتابوں کا مختصر جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

۔ترجمۂ قرآن: قرآن مجید کا اردو ترجمہ جو ترجمۂ شیخ الہند کے نام سے علمی حلقوں میں متعارف ہے آپ کا سب سے بڑا علمی کارنامہ اور زندہ جاوید یادگار ہے، اردو کے بامحاورہ ترجموں میں اس کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے، جناب عبداللہ عثمانی (ایم،اے) کے بقول آپ نے یہ عظیم الشان کام ۱۹۰۹ء میں ہندوستان کے علماء وفضلاء کے مسلسل تقاضوں کے بعد شروع فرمایا (۱۴)۔اس ترجمہ کی ابتداء دیوبند کی اقامت کے زمانہ میں ہوئی تھی لیکن انتہا مالٹا کی اسیری کے زمانے میں ہوئی، اس ترجمہ کی اصل خوبی پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا سید محمد میاں صاحب لکھتے ہیں:

''اس ترجمہ کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ترجمہ با محاورہ اور تحت اللفظ ہے اور ہر قسم کی الجھن سے پاک'' (۱۵) آپ کے اس ترجمہ کی بنیاد درحقیقت حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ کے ترجمۂ قرآن پر ہے، لیکن زمانے کے تغیرات کے باعث زبان میں تغیر بھی ایک لابدی امر ہے، اس لئے حضرت شیخ الہندؒ نے الفاظ کے انتخاب میں اپنے ذوق لطیف کا ثبوت پیش کیا ہے اور وہ الفاظ جو متروک ہو چکے تھے ان سے تعرض نہیں کیا، گویا بقول جناب مولانا اسیر ادروی صاحب:

''آپ کے ترجمہ کی مثال ایسی ہی ہے کہ عمارت کا مستحکم ڈھانچہ تو شاہ صاحب نے کھڑا کر دیا اس کی بنیاد مستحکم اور اس کے در و دیوار مضبوط ہیں، لیکن اس کی صفائی اس کی تزئین آرائش اور اس کی دیدہ زیبی میں اضافہ ڈھانچہ کے کھڑے ہونے کے بعد کا عمل ہے، حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے ذوق لطیف سے فصیح اردو زبان پر عبور کی وجہ سے یہ کارشیشہ گری انجام دیا ہے''۔(۱۶)

ترجمہ کے بعد حواشی لکھنا شروع کیا تھا کہ ۱۹۱۹ء میں رہائی ہو گئی اور یہ زریں سلسلہ رک گیا، اس کے بعد اس کی تکمیل کا سہرا آپ کے نہایت ہونہار شاگرد ومرید شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے سر بندھا جنہوں نے ایسا حاشیہ لکھا جو بقول مولانا عبدالماجد دریابادی:

''اگر ایک طرف پر مغز ہیں اور مسلک اہل سنت کے موافق محققانہ، تو دوسری طرف ضروریات کے موافق ہیں'' (۱۷)

۲۔ الأبواب والتراجم للبخاری: متوسط سائز کے ۵۲؍صفحات پر مشتمل یہ ایک نامکمل رسالہ ہے جسے بخاری شریف کے ترجمۃ الباب سے روایتوں کی تطبیق کے سلسلے میں ہندوستان میں اردو زبان کا پہلا رسالہ شمار کیا جاتا ہے۔ یہ رسالہ اسارت مالٹا کے زمانہ میں قلمبند کیا جارہا تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ کی رہائی کا وقت آ گیا، واپسی کے بعد حیات مستعار کے چند ہی مہینے باقی تھے جو قومی وملی ضرورتوں میں گذر گئے، پھر علالت کا سلسلہ شروع ہو گیا اس لئے اس نامکمل مسودہ پر نظر ڈالنے کی نوبت نہ آسکی (۱۸)

۳۔ادلۂ کاملہ: محدود صفحات کا یہ مختصر رسالہ دراصل ان مشہور اختلافی مسائل کا چشم کشا اور بصیرت افروز جواب ہے جو احناف اور غیر مقلدین میں ہمیشہ سے زیر بحث رہے ہیں، حضرت شیخ الہندؒ کے زمانے میں مولوی محمد حسین صاحب امرتسری کی طرف سے اشتہارات کی شکل میں عوام کو احناف سے بدظن کرنے اور علماء کو مشتعل کرنے کی خاطر چند سوالات مرتب کئے گئے تھے اور جواب دینے والے کو ہر جواب پر ۱۰؍روپے دینے کا اعلان کیا گیا تھا، اس وقت حضرت شیخ الہندؒ نے یہ ۱۶؍صفحوں کا رسالہ لکھا اور ان کے سارے اعتراضات کو پلٹ کر ان سے سوالات کردیئے اور فرمایا کہ اگر آپ کے ان سوالات کا جواب ترکی بہ ترکی دینا ہی مناسب سمجھا، یہاں پر ایک مثال نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ حضرت شیخ الہندؒ کے جواب میں کتنا وزن ہے، کتنی بصیرت، چابکدستی اور باریک بینی سے کام لیتے ہوئے صیاد کو خود اس کے جال میں پھانسا ہے، چنانچہ آپ تحریر فرماتے ہیں:

''آپ ہم سے رفع یدین نہ کرنے کی حدیث صحیح متفق علیہ مانگتے ہیں جو دربارہ عدم رفع نص صریح ہو، جناب من! ہم آپ سے دوام رفع یدین کی نص صریح حدیث متفق علیہ کے طالب ہیں، اگر ہو لایئے اور دس کی جگہ بیس لے جایئے، ورنہ کچھ تو شرمایئے، اور یہ بھی نہ ہو تو آپ آخری وقت نبوی ﷺ ہی میں کسی نص سے آپ کا رفع یدین کرنا ثابت کیجئے اور اگر نہ ہو سکے تو کسی کے سامنے منہ نہ کیجئے، زیادہ وسعت چاہئے تو ہم صحیح کی بھی قید نہیں لگاتے چہ جائیکہ متفق علیہ ہو، اگر اس پر بھی آپ سے کچھ نہ بن آئے تو آپ ہی فرمائیں کہ کون متبع حدیث وسنت ہے؟ آپ یا ہم؟'' (۱۹)

٤۔ ایضاح الأدلہ: یہ کتاب درحقیقت ''ادلۂ کاملہ'' جو متن کی حیثیت رکھتی ہے کی شرح ہے اور تقریباً چار سو صفحات میں آئی ہے، اور وہی سارے مسائل اور ساری بحثیں جو ادلہ کاملہ میں آئی ہیں اس میں بھی ہے، فرق صرف اختصار وتفصیل کا ہے، درحقیقت جب آپ کی کتاب ادلۂ کاملہ منظر عام پر آئی تو اس کے جواب میں مولوی احمد حسن امروہوی نام کے ایک غیر مقلد عالم نے ایک رسالہ ''مصباح الادلہ'' کے نام سے شائع کیا، جب یہ کتاب حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آئی تو آپ نے اس کے جواب میں یہ ضخیم کتاب تحریر فرمائی اور مدمقابل کے اعتراضات کے سارے تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے۔

۵۔ جہد المقل فی تنزیہ المعز والمذل: یہ کتاب دراصل اس رسالہ کی رد میں لکھی گئی جو مولانا احمد حسن کانپوری کے قلم سے ''تنزیہ الرحمٰن'' کے نام سے منصۂ شہود پر آیا، جس میں حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کو معتزلہ کے ایک متشدد گروہ میں شامل بتایا گیا تھا، بلکہ اس رسالہ پر تقریظ لکھنے والے اہل قلم نے حضرت شاہ صاحبؒ کے بارے میں سخت ترین الفاظ استعمال کئے تھے اور آپ کو مشرک وکافر اور ضال ومضل سب کچھ بنا ڈالا تھا، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ شاہ اسماعیل شہیدؒ اور آپ کے رفقاء کی تحریک اصلاح اپنے دور میں ایک مؤثر تحریک بن کر ابھری تھی جس نے بدعات وخرافات کو ختم کرنے اور مشرکانہ عقائد واعمال کو دلوں سے کھرچ کھرچ کر پھینکنے میں بڑا اہم رول ادا کیا تھا۔ بہرحال حضرت شیخ الہندؒ کی یہ کتاب علم کلام کی دقیق ترین بحثوں پر مشتمل ہے، اور علم کلام کی روشنی میں معترضین کا بھرپور اور مسکت جوابات دیتی ہے۔ (۲۰)

ان کتابوں؛ کے علاوہ چند اور آپ کے علمی کارنامے ہیں، مثلاً اُحسن القریٰ، تصحیح اُبو داؤد شریف، حاشیہ مختصر المعانی، سیاسی خطبات اور مختلف فتاوی وغیرہ۔

حضرت شیخ الہندؒ کی عظمت کا سب سے بڑا راز: تمام سوانح نگاروں کا تقریباً اس بات پر اتفاق ہے کہ حضرت، شیخ الہندؒ کا سب سے بڑا علمی کارنامہ، آپ کا سب سے بڑا کمال اور آپ کی عظمت ومحبت کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ آپ نے اپنے بعد ایسے باکمال تلامذہ کی ٹیم چھوڑی جس میں کا ہر ایک فرد اپنی جگہ آفتاب و ماہتاب ہے، تقریباً ۴٦؍سالہ تدریسی زندگی میں ہزاروں کے تعداد میں آپ نے اپنی ظاہری و باطنی برکات سے ایسی جماعت تیار کی جس کا ایک ایک فرد بقول حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہ کے ''امت کے برابر امت قانتہ ثابت ہوا، بلاشبہ ان علمی ستاروں کی چمک دمک میں شیخ الہندؒ کا علمی وعملی نور روشن نظر آتا ہے'' (۲۱)

عربی زبان کی کہاوت ہے "تعرف الثمرة بشجرها" یعنی درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اگر یہ صحیح ہے اور یقیناً صحیح ہے ''تو آپ یقین کریں کہ استاذ کے فضل وکمال، عظمت و ہمہ گیری اس کے علم وفن کی گہرائی و گیرائی اور اسکے غور وفکر کی پہنچائیوں اور وسعتوں کا اندازہ اس کے تلامذہ سے ہوتا ہے'' (۲۲) اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو حضرت شیخ الہندؒ کا سب سے بڑا کمال یہ نظر آئے گا کہ حلقۂ تلامذہ سے علم وعمل کے آفتاب و ماہتاب اٹھے، گویا مس خام کو کندن اور زر خالص بنانا، ذروں کو آفتاب بنا کر آسمان عظمت و شہرت پر چمکانا آپ کا سب سے بڑا جوہر ہے۔

بقول جناب مولانا اسیر ادروی صاحب:

''آج تک حضرت شیخ الہندؒ کا نام جس ادب واحترام اور بے پناہ عقیدت ومحبت سے لیا جارہا ہے، اس عقیدت ومحبت کا راز یہ ہے کہ آپ نے علوم اسلامیہ میں ایسے ماہرین کی جماعت پیدا کی جن میں سے بہتوں کی عبقریت اوران کی بے مثالی کو علمی دنیا نے ازخود تسلیم کرلیا، کسی استاذ کے حلقۂ درس سے اتنی بڑی تعداد اس مقام ومرتبہ کی ہم کو پچھلی کئی صدیوں تک نظر نہیں آتی'' (۲۳)

حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب کشمیریؒ فرماتے ہیں:

''حضرت مرحوم کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ حلقۂ تلامذہ سے علم وعمل کے آفتاب وقمر اٹھے۔۔۔ حضرت شاہ صاحب (علامہ انور شاہ کشمیریؒ) کے علاوہ مولانا عبید اللہ سندھیؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا کفایت اللہ صاحبؒ، علامہ شبیر عثمانیؒ، مولانا اعزاز علی صاحبؒ، مولانا فخر الدین مرحوم، مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ وغیرہ آپ کے وہ تلامذہ ہیں جو آپ کے کمالات علمی وعملی کا تعارف ہیں'' (۲۴)

اوصاف وکمالات اور امتیازات و خصوصیات: حضرت شیخ الہندؒ کی سی شخصیت چونکہ صدیوں میں بطن گیتی سے جنم لیتی ہے، اس لئے مبدأ فیض سے ایسے امتیازات وخصوصیات اور کمالات واوصاف کی ارزانی ہوئی تھی جن کی وجہ سے آپ کی شخصیت ایک دلآویز، دلکش، جامع الکمالات بلکہ متضاد اور متنوع الصفات شخصیت بن کر ابھری، ذیل میں ہم چند امتیازی کمالات کو انتہائی اختصار کے ساتھ پیش کررہے ہیں۔

شان جامعیت اور جلالت علمی:

آپ کی شخصیت کا سب سے بڑا حسن آپ کی جامعیت اور علمی جلالت شان ہے، آپ ایک وسیع المطالعہ عالم اور علم وکمال کے ایسے بحر ذخار تھے جس کی پہنائیوں کو ناپا نہیں جا سکتا ہر فن پر عبور، اسلامی علوم وفنون کے شعبوں پر گہری نظر، آپ کے تبحر علمی کا پتہ دیتی ہے، آپ کی علمی عملی جامعیت کے تذکرے کے ضمن میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ رقم طراز ہیں:

''آفتاب کو ممکن ہے کہ کچھ لوگ نہ پہچانتے ہوں، لیکن علمی دائرہ کا کون فرد ہوگا جو اس یگانہ روزگار ہستی اور اس کے فیوض و برکات سے واقف نہ ہو، علمی میدان میں عارف باللہ، عملی میدان میں مجاہد اعظم، اخلاقی میدان میں فانی فی اللہ، سیاسی میدان میں زعیم مخلص، عقلی میدان میں فرزانہ فرید، شعروادب کے میدان میں ادیب بے مثال، شخصیت کے میدان میں شیخ کامل، دارالعلوم کو اگر آسمان فرض کیا جائے تو آسمان کا سورج اپنے وقت میں شیخ الہندؒ کی ذات بابرکات تھی'' (۲۵)

جناب مولانا اسیر دروی صاحب اس پہلو پر اپنے مخصوص انداز میں یوں روشنی ڈالتے ہیں:

''اسلامی ہند میں تقریباً ایک صدی سے ایک نام گونج رہا

ہے، حدیث کے اسرار وحکم کی بحث ہو یا قرآنی علوم ومعارف کی، جدید وقدیم تعلیم کا مسئلہ ہو یا اسلامی تشخص کی بقا کا، مسلمانوں کی سیاسی تاریخ کی گفتگو ہو یا آزادی وطن کی تحریک کا تذکرہ ہر مجلس اور ہر محفل میں یہ نام انتہائی ادب و احترام اور پورے احساس عظمت کے ساتھ لیا جارہا ہے۔۔۔ وہ نام ہے حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندی شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کا جن کو انتہائی عقیدت وارادت سے صرف ''شیخ الہند'' کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے''(۲۶)

جہاں تک تعلق ہے آپ کی جلالت علمی کا تو اس سلسلے میں صرف ایک شہادت کافی ہوگی، حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی مدینہ منورہ کے زمانے میں وقتاً فوقتاً ہندوستان تشریف لایا کرتے تھے، اور جب بھی تشریف لائے تو دارالعلوم کی طرف سے کوئی نہ کوئی کتاب عارضی طور پر ہی سہی آپ سے متعلق ہو جایا کرتی، ایک بار تشریف لائے تو نسائی شریف آپ سے متعلق ہوئی، نسائی کے وقت میں طلباء کو اس کا درس دیتے اور جب بخاری شریف کا وقت ہوتا تو حضرت شیخ الہندؒ کی درسگاہ میں حاضر ہو کر طلباء کی صف میں بیٹھ جائے اور عبارت خوانی کرتے، شیخ الہندؒ جب درس دیتے شیخ الاسلام سوال پر سوال کرتے اور شیخ الہندؒ ہر سوال کا جواب اور ہر اشکال کو دور کرتے، عام طلبہ کو نہ اعتراض کرنا آتا تھا، نہ ان کا علم ہی اتنا تھا کہ وہ کوئی اعتراض یا سوال کرتے۔۔۔ سوالات کا سلسلہ اسی طرح جاری رہتا، شیخ الہندؒ چند لفظوں میں ہر عقدۂ لاینحل کو کھولتے چلے جاتے، یہ تھی حضرت شیخ الہند کی علمی جلالت شان (۲۷) سچ لکھا ہے جناب مولانا اسیر ادروی صاحب نے:

''ہندوستان کی سرزمین اسلامی علوم ومعارف کے ماہرین کی تحقیق میں کبھی بخیل نہیں رہی، حضرت شیخ الہندؒ کے دور میں بھی اہل علم کمال صف بہ صف اور قطار اندر قطار نظر آتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی علمی صلاحیت، فنی مہارت اور اپنے فضل وکمال کی علمی دنیا پر دھاک بٹھا رکھی تھی، ان کی ہمالیائی شخصیتیں اہل علم وکمال کے دل ودماغ پر چھائی ہوئی تھیں، مگر جب ان کے سامنے حضرت شیخ الہندؒ کا نام آتا ہے تو انتہائی عقیدت واحترام سے ان کی گردنیں جھک جاتی ہیں اور بہت ہی تواضع اور انکساری کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں کہ ہمارا سارا علمی کمال، ساری صلاحیت واستعداد، علوم وفنون میں ہماری نکتہ رسی، دقیقہ سنجی اور ژرف نگاہی یہ سب صدقہ ہے اسی ذات گرامی کے فیضان علم کا جس کو پورا ملک شیخ الہندؒ کے معزز لقب سے یاد کرتا ہے''(۲۸)

اخلاص و للهیت:

آپ کی شخصیت کا ایک خاص جوہر بے پناہ اخلاص تھا، کوئی کام نمود ونمائش کے لئے کرنا ناممکن تھا، ہر کام میں اخلاص وللّٰہیت آپ کا اصول زندگی تھا، اور جب اس پر حرف آیا آپ نے اس کام کو فوراً چھوڑ دیا۔(۲۹)

تواضع و بے نفسی: حضرت شیخ الہندؒ باوجودیکہ علم وکمال کی آخری چوٹی پر تھے، پر غرور علم آپ کو چھو کر بھی نہ گیا تھا تواضع وعاجزی کے آپ پیکر تھے، عاجزی وفروتنی آپ کے حرکات وسکنات سے ٹپکتی تھی "تلوح علی محیاه أمارات التواضع والهم" (۳۰)، آپ ایسے کام بھی بدست خود انجام دے لیتے تھے جو خلاف شان سمجھا جاتا ہے، گویا آپ اپنی شان بالکل مٹا چکے تھے ؎

وہ کوہ کن کی بات گئی کوہ کن کے ساتھ

سادگی و بے تکلفی: آپ تکلف وتصنع سے کوسوں دور تھے، آپ ہر چیز میں سادگی کو پسند فرماتے، باوجود کہ آپ خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، اور آپ نے جوانی کے دور میں بیش قیمت لباس بھی زیب تن کئے، لیکن حضرت نانوتویؒ کی زندگی نے آپ کے اندر جو انقلابات پیدا کیے ان میں سادگی و بے تکلفی آپ کی زندگی کا جزء لاینفک بن گئی، اب کیا تھا، ہر چیز میں اس کا ظہور خوب خوب ہوتا حتی کہ تشریف آوری کے وقت میزبان اگر آپ کے اعزاز و اکرام میں تکلف برتتا تو یہ بھی موجب ناگواری خاطر ہوتا، لیکن مصنوعی بزرگوں کی طرح میزبان کی دل شکنی نہ فرماتے۔

شعر و شاعری: حضرت شیخ الہندؒ نے شعر وشاعری کو

کبھی اپنا مشغلہ تو نہ بنایا، صلہ وتمنا اور داد وتحسین کی پرواہ کئے بغیر طویل نظمیں مرثیے کہہ اور لکھ لیا کرتے تھے ’’موزونیت طبع، ذوق نظم اور شاعری کا مذاق زمانہ طالبعلمی سے تھا، قدیم اساتذہ اور مستند شعراء، غالب، ذوق، مؤمن کے صدہا اشعار آپ کو ازبر تھے، آپ کی تقریروں اور تحریروں میں جا بجا اردو، فارسی کے اشعار نہایت خوش اسلوبی سے سجے ہیں، آپ کی شاعری بھی حالؔی کی طرح قومی درد اور اصلاحی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے‘‘ (۳۱)۔ آپ کے متفرق کلام کا مجموعہ ’’کلیات شیخ الہند‘‘ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

وفات حسرت آیات: اس دنیا میں آنا درحقیقت جانے کی تمہید ہے، جو کوئی آیا ہے وہ ایک نہ ایک دن جائے گا ضرور، موت ایک ایسی اٹل حقیقت ہے جس پر سبھوں کا اتفاق ہے، اس کے پنجہ سے نہ کوئی فرد بشر بچا ہے اور نہ بچے گا، چنانچہ ۱۸/ربیع الاول ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۱ کو یہ گنجینۂ فضل وکمال بھی دنیا کی نظروں سے ہمیشہ کے لئے پوشیدہ ہوگیا، لیکن آپ کے کارنامے اور آپ کے لگائے ہوئے پودے آج تک زندہ اور برگ وبار لا رہے ہیں اور مستقبل کا مؤرخ بھی انشاء اللہ انہیں فراموش نہیں کرسکتا۔ سچ ہے۔

مؤرخ یوں جگہ دیتا نہیں تاریخ عالم میں
بڑی قربانیوں کے بعد پیدا نام ہوتا ہے

حواشی:

(۱) سیرت مولانا سید محمد مونگیری، ص ۱۷، از سید محمد الحسنی
(۲) 〃 〃 〃 ص ۱۸-۱۹ 〃 〃
(۳) تاریخ دارالعلوم دیوبند، جلد اول ص ۵۷، از سید محبوب رضوی
(۴) سیرت مولانا سید محمد علی مونگیری، ص ۱۹
(۵) میرے عہد کے لوگ، ص ۶۲، از مولانا نسیم اختر شاہ قیصر
(۶) حضرت شیخ الہند، حیات اور کارنامے، ص ۳۲، از مولانا اسیر ادروی
(۷) تاریخ دارالعلوم دیوبند جلد اول، ص ۱۵۰۔
(۸) سوانح علمائے دیوبند، جلد دوم، ص ۴۳۵، از ڈاکٹر نواز دیوبندی
(۹) ایضا، ص ۴۳۶، ۴۳۷
(۱۰) تاریخ دیوبند، ص ۱۴۶۔ از سید محبوب رضوی
(۱۱) علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، جلد اول، ص ۷۵، از مولانا سید محمد میاں صاحبؒ
(۱۲) حضرت شیخ الہند، حیات اور کارنامے، ص ۹۰، ۹۱
(۱۳) ایضاً، ص ۹۳، ۹۴
(۱۴) چند مشاہیر، ص ۴۶، ۴۷، از عبداللہ عثمانی (ایم۔اے)
(۱۵) ایضاً، ص ۴۷
(۱۶) حضرت شیخ الہند حیات اور کارنامے، ص ۳۳۴، ۳۳۵
(۱۷) چند مشاہیر، ص ۴۷
(۱۸) حضرت شیخ الہند حیات اور کارنامے، ص ۳۳۶
(۱۹) ایضاً ص ۱۴۰
(۲۰) ایضاً بتغیر یسیر، ص ۳۴۷ تا ۳۴۹
(۲۱) دارالعلوم دیوبند کی پچاس مثالی شخصیات، ص ۶۶، از حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری طیب صاحبؒ
(۲۲) حضرت شیخ الہند حیات اور کارنامے، ص ۱۲۰
(۲۳) ایضاً، ص ۲۹
(۲۴) لالۂ وگل، ص ۳۴، از حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب کشمیریؒ
(۲۵) دارالعلوم دیوبند کی پچاس مثالی شخصیات ص ۶۴
(۲۶) حضرت شیخ الہند حیات اور کارنامے، ص ۱۴
(۲۷) ایضاً، ص ۳۱۹
(۲۸) ایضاً، ص ۱۴، ۱۵
(۲۹) ایضاً، ص ۳۲۲
(۳۰) الاعلام بمن فی تاریخ الهند من الأعلام، ص ۱۳۷۹، از علامه عبدالحیؒ
(۳۱) چند مشاہیر، ص ۵۲

☆☆☆

یاد رفتگاں

ملک زادہ منظور احمد، ایک ادیب ایک سحر طراز انشا پرداز

پروفیسر محسن عثمانی ندوی
profmohsinusmani@gmail.com

گذشتہ تھوڑے دنوں میں کئی ادبی شخصیتوں کا انتقال ہوا ،ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد بھی جو مشاعروں کے روح رواں اور شعر وادب کی دنیا کے رطل گراں تھے اللہ کو پیارے ہوگئے۔ سفر آخرت جمعہ کے دن ہوا، یہ مغفرت کی بشارت ہے،سامان مغفرت ان کے لئے ان کا ادبی ماہنامہ امکان بھی تھا جس کہ ہر شمارہ میں پابندی کے ساتھ شروع میں ایک حمد اور اس کے بعد نعت کا التزام ہوتا تھا اور یہ ان کی طرف سے اس بات کا اعلان تھا کہ ان کا تعلق اہل ادب کے اس گروہ سے نہیں ہے جو منکر خدا ہیں اور خدا اور مذہب کے ساتھ شوخیاں روا رکھتے ہیں انہوں نے اپنے اس ادبی ماہنامہ میں تین سال قبل دو قسطوں میں ایک اداریہ بھی لکھا تھا جس میں انہوں نے ان ادیبوں اور ناقدوں کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا تھا جو اہل دین کی ادبی تحریروں کے ادب اور حسن انشاء کا اعتراف نہیں کرتے اور پھر انہوں نے اپنی بات کو اس طرح مدلل کیا تھا کہ گلاب کا پھول تو ہر حال میں لائق تعریف ہے چاہے وہ میخوانہ کے دروازہ پر کھلے یا مسجد کے صحن میں اپنی بہار دکھائے۔ حق گوئی سے لبریز ایسا اداریہ لکھ کر انہوں نے کاغذ کو سیاہ لیکن اپنے نصیب کو روشن کیا تھا۔ انہوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ شبلی اسکول، ندوۃ العلماء اور دار المصنفین نے ایسے بہترین اہل قلم پیدا کئے جن کی تحریر انشاء کا معیار اور ادب کامل عیار ٹھہری۔ یہ ساری باتیں دین اسلام سے ان کی وابستگی کی دلیل ہیں۔ ماہنامہ امکان میں انہوں نے جو اداریے لکھے تھے ان کا مجموعہ شائع ہونا چاہئے۔

پروفیسر ملک زادہ منظور احمد ایک بہت اچھے شاعر بھی تھے لیکن انہوں نے مشاعروں کے ناظم کی حیثیت سے عالمگیر شہرت پائی تھی، مشاعروں کی کامیابی کا سہرا شاعروں سے زیادہ ناظم مشاعرہ کے سر ہوتا ہے، یہ ناظم مشاعرہ ہوتا ہے جو عبارت سے اشارت سے طرز ادا سے سامعین کو باندھ کر کے رکھتا ہے، کم تر درجہ کے شاعر کے کلام کو بھی سننے پر اور مناسب داد دینے پر مجبور کر دیتا ہے اسی کی وجہ سے مشاعرہ میں شعر کا وقار اور شاعر کا اعتبار ہوتا ہے ، کیونکہ اعلی درجہ کا ادبی اور شعری ذوق رکھنے والے اور شائستگی سے اور آداب محفل سے بہرہ ور سامعین ہر مشاعرہ میں بہت کم ہوتے ہیں، سب کو حدود میں رکھنا اور محفل سماع کے آداب میں مقید رکھنا بہت مشکل کام ہوتا ہے ناظم مشاعرہ در اصل ایسا انجن ہوتا ہے جو شاعروں کی برات کو یا تاروں بھری رات کو خراماں خراماں کامیابی کی منزل کی طرف لے کر چلتا ہے اور سامعین کو بڑے شاعروں کے کلام سنانے تک یہ کہہ کر صبر کا دامن تھامے رہنے پر مجبور کرتا ہے

ہے شام ابھی کیا ہے بجھتا ہے نہ جلتا ہے
کچھ رات ڈھلے ساقی میخوانہ سنبھلتا ہے

ناظم مشاعرہ کے ادبی رعنائی سے لبریز پر لطف جملے مشاعرہ میں ایک خوبصورت شعری فضا پیدا کرتے ہیں۔لکھنو میں ایک شاعر ہوا کرتے تھے جو بہت خوش آواز تھے اورلحن داؤدی رکھتے تھے،شہر میں ان کا ایک سیلون بھی تھا جس کا شعری ادبی نام بورڈ پر انہوں نے ''مرکز اصلاح گیسو'' لکھوایا تھا، ترنم اچھا تھا مشاعروں میں بلائے جاتے تھے۔ایک مشاعرہ میں انہوں بڑی خوش نوائی کے ساتھ ابھی غزل کا پہلا مصرعہ پڑھا تھا'' کہیں دکھ بھی کہیں آرام بھی ہے'' دوسرا مصرعہ پڑھنے سے پہلے شامیانہ کے ایک گوشہ سے یہ مصرعہ بلند ہوا'' یہی شاعر کہیں حجام بھی ہے'' ایک قہقہہ بلند ہوا ناظم مشاعرہ نے مجمع کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی اور یہ جملہ کہا'' حضرات مطلع اگر چہ غبار آلود ہو گیا ہے لیکن آپ توجہ سے سنیں یہ غزل ہلال آسا بھی ثابت ہو سکتی ہے۔'' ملک زادہ منظور احمد نے اپنی سرگذشت ''رقص شرر'' میں اور اپنی کتاب ''شہر سخن'' میں شعراء کی باتیں اور مشاعرہ کی رودادیں بھی کہیں کہیں لکھی ہیں۔ پٹنہ میں ایک مشاعرہ تھا جناب ملک زادہ ناظم مشاعرہ تھے، ایک ترقی پسند شاعر آئے اور یوم مئی کے عنوان سے انہوں نے نظم شروع کی سامعین نے انہیں ہوٹ کرنا شروع کر دیا ناظم مشاعرہ کی سفارش بھی کام نہ آئی اور پھر ہوٹنگ اس قدر ہوئی کہ شاعر صاحب کو الٹے قدم واپس ہونا پڑا، ملک زادہ صاحب کی آواز بلند ہوئی'' حضرات یہ میدان مشاعرہ کی پہلی شہادت ہے ''۔ایک مشاعرہ میں مشہور شاعر احمد فراز نازنینوں کے ہجوم میں گھرے ہوئے بیٹھے تھے ناظم مشاعرہ ملک زادہ منظور احمد نے ان الفاظ میں انھیں دعوت سخن دی کہ'' میں جناب احمد فراز سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اب کوئے یار سے نکل کر فراز دار تک آجائیں'' ناظم مشاعرہ کی زبان سے نکلے ہوے اس طرح کے آبدار جملے شعراء کے کلام سے مل کر مشاعرہ کو شعر وادب کی تربیت گاہ اور زبان اور ذوق کی ترقی کا ذریعہ بنا دیتے ہیں۔

ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد کی شہرت ایک بہت کامیاب ناظم مشاعرہ کی حیثیت سے شمیم گل کی طرح اردو ادب کے چمن میں پھیلی ہوئی تھی لیکن کتابوں کے مطالعہ کا ذوق اگر اردو کے حلقوں میں بالیدہ ہوتا تو لوگ ان کی کتابیں بھی پڑھتے، ان کو بہترین ادیب اور صاحب قلم کی حیثیت سے بھی یاد کرتے لیکن اردو دنیا میں کتاب نہ پڑھنے کی وبا ایک خطرناک وائرس کی طرح سرایت کر چکی ہے اب تعلیم یافتہ گھروں میں بھی کتابیں نہیں خریدی جاتی ہیں۔

کسی خوش حال گھر میں داخل ہو جایئے تو گھر میں اللہ کی دی ہوئی ہر نعمت نظر آئے گی لیکن کتاب کی سب سے بڑی نعمت سے گھر خالی ہوگا۔ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد کی یوں تو کئی کتابیں ہیں لیکن ان کی سرگذشت رقص شرر اتنی ہی اہم ہے جتنی شہاب نامہ اور یادوں کی برات، بلکہ یادوں کی برات سے بہتر اس اعتبار سے ہے کہ شرافت قلم کا نمونہ ہے، اس میں یادوں کی برات کی طرح بے حیائی اور آوارگی کے قصے نہیں ہیں۔ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد کی نگارشات ادبی شگفتگی اور بلاغت کی جان ہیں، انہوں نے اپنی کتاب ''شہر سخن'' میں مختلف شعراء کا تعارف کرایا ہے دیکھئے وہ ایک شاعرہ''شاہ جہاں بانو یاد' کے تذکرہ میں ان کے بارے میں اس طرح لکھتے ہیں ''غزل اگر غزل سنائے، ساز اگر ساز بجائے، حسن اگر آئینہ دیکھے تو خواہ مخواہ دل و دماغ پر ایک تاثر چھا جاتا ہے یہی حال ان کا بھی ہے، وہ ان کی گل پیرہنی، ان کے پڑھنے کا انداز، معانی و مطالب سے ان کے حرکات وسکنات کی ہم آہنگی، فن موسیقی میں مہارت کی بنیاد پر ان کے ترنم کا زیر و بم، ان کے لہجہ کا سوز و گداز پھر اس کے بعد سہل ممتنع سے پر ان کی سادہ و پرکار غزلیں، ان تمام چیزوں نے مل کر ان کی شخصیت کو ابھارا ہے''

مولانا انور صابری پر ان کا ایک مضمون ہے اس مضمون میں ملک زادہ صاحب کی نثر دیکھئے'' میں نہایت دیانت داری کے ساتھ کہتا ہوں کہ تقسیم ملک سے پہلے اور تقسیم ملک کے بعد پورے ہندو پاکستان میں مولانا کے اتنا زود گو دوسرا شاعر کم از میری نظروں سے نہیں گذرا، زہد جس پر رندی رشک کرے، سیاست جس پر شعریت قربان، تردامنی جس سے فرشتے وضو کریں، منکسر مزاجی جہاں کج کلاہی سر جھکائے، طریقت جس پر شریعت نثار ہو، مولانا کی شخصیت اور کردار کے مختلف پہلو ہیں'' ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد کی تحریریں پڑھئے اس میں قدم قدم پر دامان باغباں اور کف گلفروش کا منظر روح کی بالیدگی کا سامان کرتا ہوا نظر آئے گا، اس میں ادب کے ایسے نقوش مل جائیں گے جو نقش سلیمانی ہوں گے اور حرز جاں بنائے جانے کے مستحق ہوں گے اس دور میں اردو زبان کے طلبہ ہی کو نہیں بلکہ اساتذہ کو بھی اگر یہ نقوش تعویذ بنا کر پہنا دئے جائیں یا وہ ان کو اپنا وظیفہ صبح گاہی بنالیں تو ان کے بہت سے لسانی امراض کا ازالہ ہوجائے گا اور اللہ نے چاہا تو شفائے کامل وعاجل نصیب ہوگی، اچھی اردو لکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے یہ موتی پرونے کا، ہیرے تراشنے کا، گل کترنے کا، لفظوں سے چراغاں کرنے کا جملوں کی آتش بازی کرنے کا مضمون کے تاج میں کوہ نور آویزاں کرنے کا اور مرصع کاری کا ہنر ہے۔ اور کوہ نور کی بازیابی کی طرح ادب بھی ایک عسیر الحصول چیز ہے۔ ملک زادہ منظور احمد کی کتابیں زبان وبیان کی رنگینی اور شیرینی دلکشی اور دلربائی شگفتگی اور نغمگی، فنکاری اور پرکاری کی وجہ سے تخلیقی ادب کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان کو لوگ صرف ناظم مشاعرہ کی حیثیت سے جانتے ہیں ایک بہترین ادیب کی حیثیت سے بہت کم لوگ جانتے ہیں اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ لوگوں کے ہاتھ سے اب کتاب چھوٹ گئی ہے کتاب اس قوم کے ہاتھ سے چھوٹ گئی ہے جسے پڑھنے کا حکم (اقرا) دیا گیا تھا اب کتاب کی جگہ پر لیپ ٹاپ موبائیل اور کمپیوٹر آ گیا ہے۔

ملک زادہ منظور احمد سے میری ملاقات حیدرآباد میں ۲۰۰۸ میں ہوئی تھی حیدراباد اردو اکیڈمی نے میری کتاب'' تقدیر امم کا رازداں۔ مولانا ابو الکلام آزاد'' شائع کی تھی اکیڈمی نے کتاب کی رسم اجرا اور دوسرے پروگرام کے لئے ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد اور بعض دوسرے اہل قلم کو بلایا تھا ان کے ساتھ کئی نشستیں ہوئی تھیں ان سب کی یاد حافظہ میں تازہ ہے اس کے بعد مارچ ۲۰۱۵ میں ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کے جلسہ میں شرکت کے لئے لکھنو جانا ہوا تو میں ملک زادہ صاحب سے ملنے ان کے گھر بھی گیا مقصد ان سے ملاقات بھی کرنا تھا اور اپنی نئی کتاب'' کلیم عاجز، وہ ایک شاخ نہال غم'' انہیں پیش کرنا تھا جسے حیدراباد میں ہدی پبلیکیشن پرانی حویلی نے اہتمام سے شائع کیا تھا، کلیم عاجز کے وہ بہت قدرداں تھے جب کلیم عاجز کی پہلی کتاب'' وہ جو شاعری کا سبب ہوا'' کے پہلے ایڈیشن کی رسم اجرا صدر جمہوریہ جناب فخر الدین علی احمد کے ہاتھ سے وگیان بھون میں انجام پائی تو اس موقعہ پر شعری نشت کی نظامت ملک زادہ صاحب نے کی تھی،

ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد شاعر بھی تھے ادیب بھی تھے اور شرافت اور شائستگی کا مجسمہ بھی تھے انہوں نے اردو کی ترقی کے لئے بڑی خدمات انجام دی تھیں اس کا تذکرہ ان کے قلم سے تفصیل کے ساتھ رقص شرر میں موجود ہے، ان کے تذکرہ نگار بھی اس کا تذکرہ کریں گے یہ ستم ظریفی ہے کہ لکھنو اور اس کے مضافات سے جو اردو کا گہوارہ ہے اردو غائب ہوتی جارہی ہے اردو جتنی باقی ہے یہ دینی مدارس کا فیض ہے، اردو والوں نے بچوں کو اردو پڑھانا چھوڑ دیا ہے، قبرستانوں میں لوح مزار بھی اب ہندی میں لکھے ہوئے نظر آتے ہیں، وائے برمرگ غیرت وحمیت۔

☆☆☆

تعارف و تبصرہ

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

نام کتاب: زندگی کا خزانہ
صفحات: ۴۰۸
قیمت: ۲۰۰
مرتب: ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی
ملنے کا پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز

کتاب کا نام بڑا پر کشش ہے، قارئین کو دعوت مطالعہ دیتا ہے، نام کے انتخاب سے ہی مرتب کے فنی اور علمی تبحر کا اشارہ ملتا ہے، میری میز پر رکھی دیگر کتابوں کے درمیان سے صرف اسی کتاب کو لوگوں نے یہ کہتے ہوئے اٹھایا اور دیکھا ''ارے یہ کیا چیز ہے زندگی کا خزانہ'' گویا نام سے پتہ چلتا ہے کہ کوئی اہم چیز ہے، اور واقعی یہ اہم کتاب ہے جو کہ اہم موضوع پر ترتیب دی گئی ہے، یہ کتاب اشاریہ ہے ماہ نامہ ''زندگی'' کا جس میں اس کے ۱۹۴۸ سے ۲۰۱۵ تک کل ۶۷ سال کے صحافتی دور کا احاطہ کیا گیا ہے، شاریہ سازی کو جس قدر اس دور میں اہمیت حاصل ہے اسی قدر یہ کام عرق ریزی کا طالب اور صبر آزما ہے، مگر ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی صاحب کی زندگی خود ہی عرق ریزی، جفاکشی اور سراپا صبر سے عبارت ہے، اس دور مادیت میں جو الھکم التکاثر حتی زرتم المقابر کی عملی اور سچی تصویر ہے، ان کے جیسے صاحب قلم اور صاحب علم کی سادہ اور دیانت داری کے ساتھ علمی زندگی لائق تقلید بلکہ ہمہ وقت علمی و دعوتی خدمت کو زندگی کے تکلفات پر ترجیح یقیناً ہم خوردوں کے لیے مثال ہے، بے اعتدالی اور مفادات پر وارفتگی نیز جمود کے اس دور میں ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی کے قلم نے ہندو پاک میں اپنی ایک الگ شناخت قائم کی ہے، ان کی مذہبی تحریریں ہر حلقہ میں مقبول ہیں، تحریکی سرگرمیاں حد اعتدال سے تجاوز نہیں کرتیں اور فقہی بصیرت، کثرت مطالعہ اور مزاج شریعت میں غور و فکر نے ان کی فقہی تحریروں کو بھی الگ پہچان عطا کی ہے، یہ کتاب ان کی علمی کاوشوں میں ایک خوبصورت وگراں قدر اضافہ ہے، یقیناً برصغیر ہندو پاک میں یہ کاوش بھی ان کی دیگر تحریروں کی طرح قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی، بلکہ بہت سے دیگر علمی کاموں کے وجود پانے کا انشاءاللہ ذریعہ بنے گی۔

اشاریہ سازی مرتب کے لئے تو بہت مشکل کام ہے لیکن اس سے اہل علم بالخصوص ریسرچ اسکالرز اور محققین کو بڑی سہولت حاصل ہوجاتی ہے وہ ہفتوں کا کام گھنٹوں میں کرلیا کرتے ہیں، اسی لیے عہد جدید میں یہ عمل انتہائی مقبول ہے، مشہور زمانہ رسائل کے اشاریے تیار ہوکر متعارف ہو چکے ہیں، ماہنامہ زندگی کا یہ اشاریہ بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے، ظاہر ہے کہ اس میں صحافت کے ایک عہد کی جھلکیاں ہیں، بے شمار مسائل کے حل کا اشارہ ہے، الجھنوں کی تسکین کا سامان ہے، اس سے کتنے لوگوں کی مشکلیں آسان ہوں گی یہ آنے والا وقت ہی صاد کرے گا۔

اشاریہ حروف تہجی کی ترتیب پر بھی تیار کیا جاتا ہے اور موضوعاتی ترتیب پر بھی، اول الذکر قدرے مشکل بھی ہے اور اس سے استفادہ بھی آسان نہیں ــــ یا کم از کم استفادہ کی راہ محدود ہے، آخر الذکر نسبتا آسان ہے اور اس سے استفادہ مزید آسان ہے، مذکورہ اشاریہ اس دوسری قسم یعنی موضوعاتی ترتیب پر تیار کیا گیا ہے۔

کتاب کی ابتدا ماہنامہ زندگی کے موجودہ مدیر ڈاکٹر محمد رفعت کے تعارف سے ہوتی ہے، انہوں نے مختصر سے تعارف نامہ میں اشاریہ کی اہمیت واضح کی ہے، اس کے بعد ڈاکٹر رضی

الاسلام صاحب کا ''عرض مرتب'' ہے جس میں انہوں نے ماہنامہ زندگی کی تاریخ اس کے مقاصد و مشمولات پر مختصر و جامع روشنی ڈالی ہے، اسی طرح اشاریہ کے تعلق سے اہم وضاحتیں بھی کردی ہیں۔

اس کے بعد جلد و شمارہ کی فہرست بہ اعتبار ماہ و سال ہے، پھر موضوعات کی فہرست ہے، پھر بہ اعتبار موضوعات مضامین کا اشاریہ ہے، اس کے بعد اشاریہ مضمون نگاران ہے اور اشاریہ مترجمین ہے، سب سے آخر میں ''زندگی میں تبصرہ شدہ کتب و رسائل کا اشاریہ ہے۔

ماہنامہ زندگی ایک اہم علمی رسالہ ہے، جو ایک مدت سے جاری ہے، غالباً جماعت اسلامی کے تمام ارکان پر اس کو خریدنا لازمی ہے، اس طرح اس کی اشاعت بھی خاصی تعداد میں ہوتی ہے، ضروری تھا کہ اس سے استفادہ کی راہ ہموار کرتے ہوئے اس کا اشاریہ تیار کر دیا جائے، یہ اہم خدمت ایک معروف صاحب قلم نے انجام دی تو اہل علم کو شکر گزار ہونا چاہیے۔

واقعی یہ خزانہ ہے اور علمی زندگی کا خزانہ ہے کیوں کہ اس پر نظر ڈالنے سے بہت سے نئے پہلو سامنے آئیں گے، بہت سے تشنہ موضوعات پر نظر پڑے گی، علمی کاوشوں کو تحریک ملے گی، بہت سے مباحث کا مطالعہ آسان ہوگا، فکر کو بحث و تحقیق کی روشنی ملے گی، کیوں کہ ''زندگی'' اشارات، مطالعۂ قرآن، ارشادات رسول، مقالات، تراجم واقتباسات، اخبار و افکار، رسائل و مسائل، روداد و اجتماعات اور تنقید و تبصرہ جیسے مستقل کالموں پر مشتمل ہوتا ہے، اب ظاہر ہے کہ ان کالموں میں ہزاروں موضوعات زیر بحث آئے ہوں گے، جن پر مزید بحث و تحقیق کی گنجائش ہوگی، ایسے بیش قیمت علم کے موتی ہوں گے جن سے بآسانی شناسائی ممکن ہو سکے گی، ایسے افکار ہوں گے جن سے رہنمائی ہوگی اور یہ سارے کام بہ آسانی اس اشاریہ کی مدد سے انجام دیے جا سکیں گے، اہل علم کو اس سے استفادہ کرنا چاہیے اور ڈاکٹر صاحب کی اس کاوش کا خیر مقدم کرنا چاہیے بلکہ ہاتھوں ہاتھ لینا چاہیے، یقیناً اس کے ذریعے انہوں نے اپنے نامۂ اعمال میں بے شمار نیکیوں کے اضافہ کا سامان کر لیا ہے، فجزی الله عنا وعن اهل العلم والباحثين جميعا۔

☆☆☆

مغربی نظام تمدن، موجودہ صورت حال کا ذمہ دار

دنیا کشت و خون کے مناظر سے اکتا گئی ہے، جنگ و جدل کے نام سے وہ لرزنے لگی ہے، اور اس سے بچنے کے لئے ہر ممکن ذریعہ سے وسیلہ تلاش کر رہی ہے، لیکن کیا اس سعی میں کامیابی کی بھی صورتیں ہیں، کہ اقوام اپنے تئیں جنگی شقاوت و حربی سنگ دلی کے لئے روز بروز تیاری کرتی رہیں، لیکن درحقیقت اس میں کسی مخصوص فرد یا قوم کا قصور نہیں، بلکہ یہ صورت حال لازمی نتیجہ ہے اس نظام تمدن کا، جس کی سیادت کا شرف یورپ و امریکہ کو حاصل ہے، اور جو بالواسطہ اس وقت ساری دنیا پر حاوی و محیط ہے، جس ضابطۂ اخلاق میں انکسار و فروتنی، غیرت و قناعت کا کوئی درجہ نہ ہو جس طرز معاشرت میں بلند ترین مرتبہ عالی حوصلگی و بلند نظری کو دیا گیا ہو، اور جس نظام تمدن کی بنیاد تمام تر ''تنازع للبقا'' مسابقت و باہمی کشمکش پر ہو، اس کے علمبرداروں سے یہ توقع رکھنا کہ ان کی کوششیں مستقل و پائیدار امن و امان کو وجود میں لا سکیں گی، گرگ سے گلہ بانی کی امید قائم کرنا ہے۔ (شذرات: علامہ سید سلیمان ندویؒ)

(بقیہ صفحہ نمبر ۳۸ کا)

...... اس کی سب سے بڑی وجہ، علماء کی صحافت پر چھاپ رہی ہے، ہلال، ہمدرد، کامریڈ، زمیندار اور ملک کی مکمل آزادی کے خوگر ہندوؤں کے اخبارات نے یکسوئی کو فروغ دیا، اور سویم سیوکوں کا وقار واثر معاشرہ میں بڑھنے نہ دیا۔۔ آج ہندوستان میں انگریزوں کے حاشیہ بردار رہے سویم سنگھ کا غلغلہ ہے، وہ انگریز ہی کی طرح پھوٹ ڈالنے اور حکومت کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہے، ایسے میں یہ لڑائی محض برکھادت اور تیستا سیتلواد کی نہیں رہ گئی ہے، بلکہ یہ مسلمانوں کے سیاسی وجود اور دیگر پس ماندہ طبقات کے حقوق کی لڑائی ہے، اگر نوجوان علماء اپنے علوم عالیہ کے ساتھ ساتھ، علومِ آلیہ (پالیٹکل سائنس) کو وزن دیں، تو ملک ومعاشرہ پر احسان ہوگا، تعجب ہے ان سادہ لوح بھائیوں پر جو ایک ایک سے مل کے معاشرہ بدلنے میں یقین رکھتے ہیں، مگر صحافت اور میڈیا کے ذریعہ، بیشمار لوگوں کو مخاطب کرکے، معاشرہ تشکیل دینے کو غیر اہم سمجھتے ہیں۔ مدارس کی جڑیں ملک و معاشرہ میں اسقدر پیوست ہیں، مسلمانوں اور دوسرے مظلوم طبقوں پر کوئی ظلم وستم ہو، تو ایک ملی خبر رساں ایجنسی، اس واقعہ کو سرخیوں میں پیش کرکے، اور سوشل میڈیا پر جاری کرکے، فاشسٹ طاقتوں کو مبہوت کرسکتی ہے۔ آج ضرورت ہے کہ مسلمان اور دیگر مظلومین کی جان و مال کو وقار کا مسئلہ بنایا جائے، اور یہ کام سماج کی گہرائیوں میں پیوست جڑوں کے ذریعہ، علماء ؒ، ہم خیال مدرسین اور دیانتدار صحافی کرسکتے ہیں۔

باہمی گفت وشنید کے دوران، اِس سمت میں احباب کی طبیعت چلتی دکھائی دیتی ہے، اللہ انکے افکار وجذبات کو عملی میدان عطا فرمائے، اور جا بجا اہلِ فکر ودانش باہم مل بیٹھ کے، مخلصانہ پہل کریں، یہاں وہاں کے قطرے، پرنالوں سے گزر کے سیلِ رواں ہوں گے، ان شاء اللہ۔

☆☆☆

جامعۃ البنات حیدرآباد
JAMIATUL BANATH HYDERABAD

شعبہ حفظ
عالمیت فضیلت

لڑکیوں کا اعلی و معیاری دینی ۲۸ سالہ قدیم جامعہ

شہر کے اہم مقامات
سے بسوں کی سہولت

دینی تعلیم کے علاوہ انگریزی وکمپیوٹر بھی سکھایا جاتا ہے۔ جس کے لئے خاص کمپیوٹر لیب پوری ضرورتوں سے آراستہ ہے۔
عثمانیہ یونیورسٹی (اورینٹل لینگویجس) کے ذریعہ میٹرک، انٹر، بی اے کے امتحانات بھی دلوائے جاتے ہیں۔
ایک سالہ اسلامک ڈپلومہ (کالج کی طالبات کے لئے) شعبۂ تربیت۔ دبلوم العالی فی علوم الشرعیہ۔
(فارغات دینی مدارس کے لئے ایک نادر موقع)

والدین سے گزارش ہے کہ اپنی لڑکیوں کی بہترین تعلیم وتربیت کے لئے اس جامعہ میں داخلہ دلوائیں۔

نوٹ: (۱) اضلاع کے طالبات کے لئے جامعہ میں معیاری ہاسٹل کی سہولت ہے۔ (۲) شہر میں اس جامعہ کی اور کوئی شاخ نہیں ہے۔

صاحب خیر حضرات جو جامعہ کا تعاون کرنا چاہتے ہیں
ہمارے بینک اکاونٹ نمبرس:

JAMIATUL BANATH HYDERABAD
Ac/No. 05110011021119. (Andhra Bank)
Ac/No. 19380100018623 (Bank of Baroda)

پتہ: جیون یار جنگ کالونی، روبرو مدینہ میڈیکل ہال، VIP اسکول کی گلی، سعید آباد، حیدرآباد۔
رابطہ نمبر: 7032101979,9848431304,(040)24553534
Website:www.jamiatulbanath.org